شمارہ نمبر 20

جمادی ثانیہ، ۱۴۳۱ھ، جون ۲۰۱۰ء

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

- اللہ کہاں ہے؟
- اوقاتِ نماز
- قارئین کے سوالات
- اسلاف پرستی سے اصنام پرستی تک !
- صحیح بخاری کا مطالعہ اور فتنۂ انکارِ حدیث

دار التخصص والتحقیق، جہلم، پاکستان

شمارہ نمبر 19 ، جمادی اولیٰ ۱۴۳۱ھ، مئی 2010

اہل سنت والجماعت کا اجماعی و اتفاقی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور اپنی مخلوق سے جدا ہے۔ جیسا کہ:

① امام مالک بن انس رحمہ اللہ (م ۱۷۹ھ) فرماتے ہیں: **اللّٰہ عزّ وجلّ فی السّماء ، وعلمه فی کلّ مکان ، لا یخلوا من علمه مکان .** ''اللہ عزوجل آسمانوں سے اوپر (عرش پر) ہے، لیکن اس کا علم ہر جگہ میں ہے، کوئی جگہ اس کے علم سے خالی نہیں۔''

(الشریعة للآجری : ۳ /۱۰۷۶ـ۱۰۷۷، الرقم : ۶۵۲ـ۶۵۳، مسائل الامام احمد لابی داوٗد : ص ۲۶۳، التمهید لابن عبد البر : ۱۳۸/۷، وسندهٗ صحیحٌ)

② امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ (م قبل ۱۵۰ھ) فرمانِ باری تعالیٰ : ﴿**مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ**﴾ (المجادلة : ۷) (کوئی تین شخص سرگوشی نہیں کرتے، مگر اللہ تعالیٰ ان کا چوتھا ہوتا ہے) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: **هو علی العرش ، وعلمه معهم .**

''اللہ تعالیٰ عرش پر ہی ہے، لیکن اس کا علم ان کے ساتھ ہے۔''

(تفسیر الطبری : ۱۲/۲۸، الشریعة للآجری : ۶۵۵، وسندهٗ صحیحٌ)

③ شیخ الاسلام، المجاہد، القدوہ، الامام، عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ (م ۱۸۱ھ) کے بارے میں امام، حافظ، ثقہ، علی بن الحسن بن شقیق رحمہ اللہ (م ۲۱۵ھ) بیان کرتے ہیں:

سألت عبد اللّٰہ بن المبارک : کیف ینبغی لنا أن نعرف ربّنا عزّوجلّ ؟ قال : علی السّماء السّابعة علی عرشه ، بائن من خلقه ، ولا نقول کما تقول الجهمیّة : انه هاهنا فی الأرض . ''میں نے امام عبداللہ بن المبارک سے سوال کیا، ہمیں اپنے ربّ عزوجل کو کس طرح پہچاننا چاہیے؟ آپ رحمہ اللہ نے فرمایا، (اللہ تعالیٰ) ساتویں آسمان کے اوپر اپنے عرش پر ہے، اپنی مخلوق سے جدا ہے، ہم جہمیوں کے طرح یہ نہیں کہتے کہ وہ یہاں زمین میں ہے۔'' (السنة لعبد اللہ بن احمد : ۱۱۱/۱، ح : ۲۲، ۱۷۴/۱ـ۱۷۵، ح : ۲۱۶، الرد علی المریسی

للدارمی : ص ۱۰۳ ، الرد علی الجھمیة للدارمی : ص ۵۰ ، الاسماء والصفات للبیھقی : ۹۰۳، وسندہٗ صحیحٌ)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس قول کے بارے میں فرماتے ہیں: **هذا صحیح ثابت .**

''یہ قول صحیح اور ثابت ہے۔'' (العرش للذھبی : ۲/۲۴۰)

حافظ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وروی عبد اللّٰـه بن الامام أحمد وغیره بأسانید صحیحة عن ابن المبارک .** ''(اس قول کو) امام احمد کے بیٹے عبداللہ وغیرہ نے صحیح سند کے ساتھ امام عبداللہ بن المبارک سے نقل کیا ہے۔'' (الفتوی الحمویة لابن تیمیة : ص ۹۱)

حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وقد صحّ عنه صحّة قریبة من التواتر .**

''یہ قول آپ (امام عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ) سے اس قدر صحیح ثابت ہے کہ متواتر کے قریب پہنچ گیا ہے۔'' (اجتماع الجیوش الاسلامیة لابن القیم : ۲۱۳۔۲۱۴)

④ امام عبدالرحمٰن بن مہدی العنبری رحمہ اللہ (م ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں:

وأرادوا أن ینفوا أن یکون الرّحمن علی العرش استویٰ ، وأرادوا أن ینفوا أن یکون القرآن کلام اللّٰه تعالیٰ ، أری أن یستتابوا ، فإن تابوا ، وإلّا ضربت أعناقهم .

''ان جہمیہ نے ارادہ کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا انکار کردیں، اسی طرح انہوں نے یہ بھی ارادہ کیا ہے کہ وہ قرآن کے کلامِ باری تعالیٰ ہونے کا انکار کردیں، میرا خیال ہے کہ ان سے توبہ کروائی جائے، اگر یہ توبہ کریں تو درست، ورنہ ان کی گردنیں اُڑا دی جائیں۔''

(الاسماء والصفات للبیھقی : ۵۴٦، وسندہٗ حسنٌ)

⑤ امام محمد بن مصعب العابد رحمہ اللہ (م ۲۲۸ھ) فرماتے ہیں:

من زعم أنّک لا تکلّم ولا تُری فی الآخرة ، فهو کافر بوجهک ، لا یعرفک ، أشهد أنّک فوق العرش فوق سبع سماوات ، لیس کما یقول أعدائک الزّنادقة .

''(اے اللہ!) جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ آخرت میں تجھ سے کوئی کلام نہیں کرے گا، نہ ہی کوئی تیرا دیدار کرسکے گا، وہ تیرے چہرے کا منکر اور تیری ذات سے جاہل ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے، ایسا نہیں ہے، جیسے تیرے دشمن زندیق لوگ کہتے ہیں (یعنی وہ کہتے ہیں

کہ تو ہر جگہ ہے)۔'' (تاریخ بغداد للخطیب : ۲۸۰/۳، وسندہٗ صحیحٌ)

⑥ امام حمیدی رحمہ اللہ (م ۲۱۹ھ) فرماتے ہیں: **السّنّة عندنا ... يقول (الرّجل) : ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ، ومن زعم غير هذا ، فهو معطّل جهميّ .** ''ہمارے نزدیک سنت یہ ہے کہ۔۔۔آدمی کہے، رحمٰن عرش پر مستوی ہے، اور جو شخص اس کے خلاف کوئی دعویٰ کرتا ہے، وہ معطِّل (صفاتِ باری تعالیٰ کا منکر) اور جہمی ہے۔''

(اصول السنة للحمیدی : ص ۵۴۷، مندرج فی آخر مسندہ)

⑦،⑧ امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام ابوزرعہ الرازی رحمہ اللہ (م ۲۶۴ھ) اور (اپنے والد) امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ (م ۲۷۷ھ) سے اہل سنت والجماعت کے اجماعی و اتفاقی عقیدہ و مذہب کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا:

أدركنا العلماء في جميع الأمصار ، حجازا وعراقا ، ومصرا وشاما ، ويمنا ، وكان من مذهبهم أنّ اللّٰه على عرشه بائن من خلقه ، كما وصف نفسه بلا كيف ، أحاط بكلّ شيء علما . ''ہم نے تمام علاقوں، حجاز، عراق، مصر، شام اور یمن میں علمائے کرام کو دیکھا ہے، ان کا عقیدہ و مذہب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی اور اپنی مخلوق سے جدا ہے، جیسا کہ اس نے خود بیان فرمایا ہے، کوئی کیفیت بیان نہیں کی جائے گی، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنے علم کے اعتبار سے گھیر رکھا ہے۔'' (کتاب اصل السنة واعتقاد الدین لابن ابی حاتم : ص ۱۹۔۲۶)

⑨ امام عثمان بن سعید الدارمی رحمہ اللہ (م ۲۸۰ھ) فرماتے ہیں:

قد اتّفقت الكلمة من المسلمين أنّ اللّٰه تعالىٰ (بكماله) فوق عرشه فوق سماواته . ''اس بات پر مسلمانوں کا کلمہ ایک ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کمال کے ساتھ اپنے آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر ہے۔'' (الرد علی بشر المریسی : ۳۴۰/۱)

⑩ امام محمد بن عثمان بن ابی شیبہ رحمہ اللہ (م ۲۹۷ھ) فرماتے ہیں:

ذكروا أنّ الجهميّة يقولون : ليس بين اللّٰه عزّ وجلّ وبين خلقه حجاب ، وأنكروا العرش ، وأن يكون هو فوقه وفوق السّماوات ، وقالوا : إنّ اللّٰه في كلّ مكان . ''انہوں نے ذکر کیا ہے کہ جہمی لوگوں کے بقول اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے

درمیان کوئی پردہ نہیں، نیز انہوں نے اللہ تعالیٰ کے آسمانوں کے اوپر عرش پر ہونے کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ میں ہے۔" (کتاب العرش لابن ابی شیبة : ۲)

نیز فرماتے ہیں: **ثمّ تواترت الأخبار أنّ اللّٰہ تعالیٰ خلق العرش فاستوی علیہ بذاتہ ، فھو فوق السّماوات ، وفوق العرش بذاتہ ، متخلّصا من خلقہ ، بائنا منھم ، علمہ فی خلقہ ، لا یخرجون من علمہ .** "احادیثِ متواترہ اس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ اپنے عرش پر مستوی ہے، چنانچہ وہ آسمانوں کے اوپر اپنی ذات کے ساتھ عرش پر ہے، اپنی مخلوق سے علیحدہ وجدا ہے، اس کا علم اس کی مخلوق میں ہے، وہ اس کے علم سے باہر نہیں ہو سکتے۔" (کتاب العرش لابن ابی شیبة : ۲)

تلک عشرة کاملة یہ پورے دس اقوالِ محدثین ہیں۔

❀❀❀❀❀❀❀

ٹھنڈا پانی

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أوّل ما یحاسب بہ العبد یوم القیامة أن یقال : ألم أصحّ جسمک ، وأروک من الباء البارد ؟

"قیامت کے دن بندے سے سب سے پہلے جو حساب کیا جائے گا، وہ یہ کہا جائے گا کہ کیا میں نے تیرے جسم کو تندرستی نہیں دی تھی اور کیا میں نے تجھے ٹھنڈے پانی سے سیراب نہیں کیا تھا؟

(سنن الترمذی : ۳۳۵۸، الاوائل لابن ابی عاصم : ۸۵، ۱۵۴، تفسیر ابن جریر : ۳۰/ ۲۸۸، زوائد الزھد لعبد اللہ بن احمد : ص ۴۰، المعجم الاوسط للطبرانی : ۶۲، شعب الایمان للبیھقی : ۴۲۸۷، وسندہٗ صحیحٌ)

اس حدیث کو امام ابن حبان (۷۳۶۴) اور امام حاکم (۱۳۸/۴) نے "صحیح" کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾ (النساء : ۱۰۳)

''بے شک نماز ایمان والوں پر متعین ومقرر اوقات میں فرض کی گئی ہے۔''

ظہر کا وقت :

اللہ کے فضل ورحمت سے اس بات پر اجماعِ مسلمین ہے کہ نمازِ ظہر کا وقت زوال کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے، جیسا کہ:

① امام ابن المنذر رحمہ اللہ (م ۳۱۸ھ) کہتے ہیں: **أجمعوا على أنّ وقت الظّهر زوال الشّمس .** ''اس بات پر مسلمانوں نے اجماع واتفاق کیا ہے کہ ظہر کا وقت سورج کے زوال سے شروع ہوتا ہے۔'' (الاجماع لابن المنذر : ۳٦)

نیز دیکھیں (الاوسط لابن المنذر : ۳۲٦/۲، ۳۵۵، الاستذکار لابن عبد البر : ۳۸/۱، التمهيد لابن عبد البر : ۷۰/۸، الافصاح لابن هبيره : ۷٦/۱، المبسوط للسرخسی : ۱٤۲/۱، عارضة الاحوذی لابن العربی : ۲۵۵/۱، بدائع الصنائع للکاسانی : ۳۵۰/۱، المجموع للنووی : ۲٤/۳، فتح الباری لابن حجر : ۲۱/۲، وغيرهم)

② سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **وقت الظّهر إذا زالت الشّمس ...** ''جب سورج ڈھل جائے تو ظہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔'' (صحيح مسلم : ٦۱۲/۱۷۳)

③ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إذا صلّينا خلف رسول الله صلّى الله عليه وسلّم بالظّهائر سجدنا على ثيابنا اتّقاء الحرّ .

''جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نمازِ ظہر ادا کرتے تھے تو گرمی کی سوزش سے بچنے کے لیے

کپڑے پر سجدہ کرتے تھے۔'' (صحیح البخاری : ۵۴۲، صحیح مسلم : ۶۲۰)

④ سیدنا جناب بن الارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

شکونا إلی رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم الصّلاۃ فی الرّمضاء ، فلم یشکنا .

''ہم نے رسول اللہ ﷺ سے گرمی میں نمازِ (ظہر) کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے ہماری شکایت کو دور نہیں فرمایا۔'' (صحیح مسلم : ۶۱۹)

⑤ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف خط میں لکھا:

أن صلّ الظّھر إذا زاغت الشّمس . ''جب زوالِ شمس ہو جائے تو ظہر کی نماز ادا کرو۔'' (الموطا للامام مالک : ۷/۱، وسندہٗ صحیحٌ)

⑥ میمون بن مہران رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: **إنّ سوید بن غفلۃ کان یصلّی حین تزول الشّمس ، فأرسل إلیہ الحجّاج : لا تسبقنا بصلاتنا ، فقال سوید : قد صلّیتھا مع أبی بکر وعمر ھکذا ، والموت أقرب إلیّ من أن أدعھا .**

''سوید بن غفلہ تابعی رحمہ اللہ زوالِ شمس کے وقت نمازِ ظہر ادا کیا کرتے تھے، حجاج نے آپ رحمہ اللہ کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ ہماری نماز سے پہلے نماز نہ پڑھا کریں، اس پر سوید رحمہ اللہ نے جواب دیا، میں نے سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ یہ نماز اسی وقت میں ادا کی ہے۔ اس کو چھوڑنے سے مجھے موت زیادہ محبوب ہے۔'' (کتاب الصلاۃ لابی نعیم الفضل بن دکین : ۳۴۴، مصنف ابن ابی شیبۃ : ۳۲۳/۱، وسندہٗ صحیحٌ)

⑦ شہاب العنبری کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ظہر کے وقت کے بارے میں سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: **إذا زالت الشّمس عن نصف النّھار وکان الظّلّ قیس الشّراک فقد قامت الظّھر .**

''جب سورج نصف النہار سے ڈھل جائے اور سایہ ایک تسمہ کے برابر ہو جائے تو ظہر کی نماز کا وقت ہو جائے گا۔'' (مصنف ابن ابی شیبۃ : ۳۲۳/۱، وسندہٗ صحیحٌ)

تنبیہ نمبر ① : وہ احادیث جن میں نمازِ ظہر کو گرمی کی وجہ سے ٹھنڈا کرنے کا حکم ہے، ان کا تعلق سفر سے ہے، نہ کہ حضر سے۔ (دیکھیں صحیح البخاری : ۷۷/۱، ح :

٥٣٩، صحیح مسلم : ١/٢٢٤، ح : ٦١٦)

تنبیہ نمبر ② : صحیح البخاری (١/٤٩١، ح : ٣٤٥٩) میں ہے کہ

یہودیوں نے آدھے دن تک ایک قیراط پر کام کیا اور عیسائیوں نے آدھے دن سے عصر تک ایک قیراط پر کام کیا اور مسلمانوں نے عصر سے شام تک دو قیراط پر کام کیا تو یہود و نصاریٰ نے اس پر اعتراض کیا کہ ان کا وقت تھوڑا ہے اور اجرت زیادہ ہے۔۔۔

اس حدیثِ پاک سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ظہر سے لے کر عصر تک کا وقت عصر سے شام تک کے وقت سے زیادہ ہے اور بس!

ظہر کا آخری وقت :

نمازِ ظہر کا وقت ایک مثل سایہ پر ختم ہوجاتا ہے، اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔

① سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أمّني جبريل عند البيت مرّتين ، فصلّى بي الظّهر حين زالت الشّمس ، وكانت بقدر الشّراك ، وصلّى بي العصر حين كان ظلّ كلّ شيء مثله ، وصلّى بي المغرب حين أفطر الصّائم ، وصلّى بي العشاء حين غاب الشّفق ، وصلّى بي الفجر حين حرم الطّعام والشّراب على الصّائم ، وصلّى بي الغد الظّهر حين كان ظلّ كلّ شيء مثله ، وصلّى بي العصر حين كان ظلّ كلّ شيء مثليه ، وصلّى بي المغرب حين أفطر الصّائم ، وصلّى بي العشاء ثلث اللّيل ، وصلّى بي الفجر فأسفر ، ثمّ التفت إليّ فقال : يا محمّد ! هذا الوقت وقت النّبيّين قبلك ، الوقت ما بين هذين الوقتين . ”جبریل علیہ السلام نے مجھے بیت اللہ کے پاس دو دفعہ امامت کروائی، چنانچہ نمازِ ظہر پہلی دفعہ اس وقت پڑھی، جب سورج ڈھل گیا اور سایہ ایک تسمہ کے برابر تھا اور نمازِ عصر مجھے (پہلی دفعہ) اس وقت پڑھائی، جب ہر چیز کا سایہ اس کی مثل ہوگیا اور نمازِ مغرب اس وقت پڑھائی، جب روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے۔ نمازِ عشاء (پہلی دفعہ) اس وقت پڑھائی، جب شفق (سرخی) غائب ہوگئی تھی اور نمازِ فجر اس وقت پڑھائی، جب کھانا پینا روزہ دار پر حرام ہوجاتا ہے (لیکن جب دوسرا دن ہوا تو) نمازِ ظہر مجھے اس وقت پڑھائی، جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہوگیا، نمازِ عصر مجھے اس وقت

پڑھائی، جب ہر چیز کا سایہ دومثل ہوگیا تھا، نمازِ مغرب اسی وقت پڑھائی، جب روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے اور عشاء رات کی ایک تہائی گزرنے کے بعد پڑھائی اور فجر روشنی میں ختم کی، پھر جبریل علیہ السلام میری طرف متوجہ ہوکر گویا ہوئے، اے محمد! یہ آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کا وقت ہے۔ (آپ اور آپ کی امت کے لیے) نمازوں کا وقت ان دونوں (اول وآخر) وقتوں کے درمیان ہے۔''

(مسند الامام احمد : ۱/ ۳۳۳، ۳۵٤، مسند عبد بن حمید : ۷۰۳، سنن ابی داوٗد : ۳۹۳، سنن الترمذی : ۱٤۹، سنن الدارقطنی : ۲۵۸/۱، المستدرك للحاکم : ۱۹۳/۱، وسندہٗ حسنٌ)

اس حدیث کو امام ابن الجارود رحمہ اللہ (۱۴۹۔۱۵۰)، امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ (۳۲۵) نے ''صحیح'' اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''حسن صحیح'' اور حافظ بغوی رحمہ اللہ (۳۴۸) نے ''حسن'' کہا ہے۔

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند پر بعض الناس نے بغیر دلیل کے کلام کی ہے، اللہ کی قسم! اس کے سارے راوی معروف النسب اور مشہور بالعلم ہیں۔''

(التمهيد لابن عبد البر : ۲۵/۸۔۲٦، ۲۷۔۲۸)

علامہ ابن العربی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''حدیثِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے سارے کے سارے راوی مشہور ثقہ ہیں، خاص کر امامتِ جبریل کے متعلق حدیث کی اصل صحیح ہے، یہ روایت مجمل کی تفسیر اور مشکل کی وضاحت ہے۔'' (عارضة الاحوذی : ۱/ ۱۵۰۔۲۵۱)

اس کے راوی عبدالرحمٰن بن حارث کو امام ابنِ سعد، امام عجلی اور امام ابنِ حبان رحمہم اللہ نے ثقہ کہا ہے۔ امام ابنِ معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **لیس به بأس** . ''اس میں کوئی خرابی نہیں۔''

نیز جمہور کے نزدیک یہ ''موثق، حسن الحدیث'' ہے۔ اس پر امام نسائی رحمہ اللہ کی جرح مردود ہے۔

اس کے دوسرے راوی حکیم بن حکیم کو امام عجلی، امام ابنِ حبان اور ابنِ خلفون رحمہم اللہ نے ثقہ کہا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ راوی ہے۔ (المغنی للذهبی : ۱/ ۱۸۳)

نیز فرماتے ہیں کہ یہ ''حسن الحدیث'' ہے۔ (الكاشف للذهبی : ۱/ ۱۸۵)

امام ابنِ سعد رحمہ اللہ کی جرح کئی وجہ سے مردود ہے، لہٰذا حکیم بن حکیم راوی جمہور کے نزدیک ''حسن الحدیث'' ہیں۔

② سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وقت الظّهر إذا زالت الشّمس و كان ظلّ الرّجل كطوله ما لم تحضر العصر .

''ظہر کا وقت ہوتا ہے، جب سورج ڈھل جائے اور (ختم تب ہوتا ہے، جب) آدمی کا سایہ اس کے قد کے برابر ہو جائے، جب تک کہ عصر کا وقت شروع نہ ہو۔'' (صحیح مسلم : ۲۲۳/۱، ح : ۶۱۲)

جناب تقی عثمانی دیو بندی صاحب کہتے ہیں: ''مثلین پر ظہر کا وقت ختم ہونے کے سلسلہ میں عموماً احناف کی طرف سے تین دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی حدیث بھی اوقات کی تحدید پر صریح نہیں ہے، اس کے برخلاف حدیثِ جبرئیل میں صراحتاً پہلے دن عصر کو مثل اول پر پڑھنے کا ذکر موجود ہے، اس لیے یہ حدیثیں حدیثِ جبریل کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، اس بنا پر بعض حنفیہ نے مثل اول والی روایت کو لیا ہے۔ کما فی الدر المختار اور بعض حنفیہ نے وقتِ مہمل کو ترجیح دی ہے۔'' (درس ترمذی از تقی عثمانی : ۳۹۶/۱)

جناب محمد بن علی نیموی حنفی اعترافِ حقیقت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''مجھے کوئی حدیث صریح، صحیح یا ضعیف نہیں ملی، جو اس پر دلالت کرے کہ ظہر کا وقت سایہ کے دو مثل ہونے تک ہے۔'' (آثار السنن مترجم : ص ۱۲۸، ح : ۱۹۹)

الحاصل : نمازِ ظہر کا اول وقت زوال کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے اور ایک مثل سایہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

نماز عصر کا وقت

نمازِ عصر کا وقت ایک مثل سایہ پر شروع ہو جاتا ہے اور دو مثل سایہ پر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

① سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أمّني جبريل عليه السّلام عند البيت مرّتين ... ثمّ صلّى العصر حين كان ظلّ كلّ شيء مثله ... ''جبریل علیہ السلام نے مجھے بیت اللہ کے قریب دو مرتبہ نماز پڑھائی۔۔۔ پھر عصر کی نماز اس وقت پڑھائی، جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا۔۔۔''

(مسند الامام احمد : ۳۳۳/۱، ۳۵۴، مسند عبد بن حمید : ۷۰۳، سنن ابی داوٗد : ۳۹۳، سنن الترمذی : ۱۴۹، سنن الدارقطنی : ۲۵۸/۱، المستدرك للحاكم : ۱۹۳/۱، وسندهٗ حسنٌ)

فائدہ جلیلہ : عبداللہ بن رافع مولیٰ ام سلمہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

سے اوقاتِ نماز کے بارے میں پوچھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

أنا أخبرک ، صلّ الظّهر إذا کان ظلّک مثلک ، والعصر إذا کان ظلّک مثلیک . ''میں تمہیں بتاتا ہوں، ظہر کی نماز اس وقت پڑھو، جب تمہارا سایہ ایک مثل ہو جائے اور عصر کی نماز اس وقت پڑھو، جب تمہارا سایہ دو مثل ہو جائے۔''

(الموطا للامام مالك : ۸/۱، وسندهٗ صحيحٌ)

علامہ عبدالحئ لکھنوی حنفی اس اثر کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فکأنّه قال : الظّهر من الزّوال إلی أن یکون ظلّک مثلک ، والعصر من ذلک الوقت إلی أن یکون ظلّک مثلیک ... ''گویا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ ظہر کا وقت زوال سے لے کر تمہارے سائے کے ایک مثل ہونے تک ہے اور عصر کا وقت اس وقت سے لے کر تمہارے سائے کے دو مثل ہونے تک ہے۔''

(التعليق الممجد لعبد الحى اللكنوى : ۴۱/۱، حاشية : ۹)

ثابت ہوا کہ ظہر کا وقت زوال سے لے کر ایک مثل سایہ تک رہتا ہے، جبکہ عصر کا وقت ایک مثل سے لے کر دو مثل تک رہتا ہے۔ بعض لوگ سنت کی مخالفت میں عصر کا اول وقت بغیر عذر کے ترک کر دیتے ہیں۔ حدیث میں ان کے بارے میں وعیدِ شدید آئی ہے، جیسا کہ

علاء بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں: **انّه دخل علی أنس بن مالک فی داره بالبصرة حین انصرف من الظّهر وداره بجنب المسجد ، فلمّا دخلنا علیه قال : أصلّیتم العصر ؟ فقلنا له ، فلمّا انصرفنا قال : سمعت رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم یقول : تلک صلاة المنافق ، یجلس یرقب الشّمس حتی إذا کانت بین قرنی الشّیطان قام ، فنقرها أربعا ، لا یذکر اللّٰه فیها إلّا قلیلا ...**

''وہ نماز سے فارغ ہو کر سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے گھر گئے، جو بصرہ میں واقع تھا، آپ کا گھر مسجد کے پڑوس میں تھا، جب ہم آپ پر داخل ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کیا تم نے عصر کی نماز پڑھ لی ہے؟ ہم نے کہا، ہم ابھی نماز سے فارغ ہوئے ہیں، فرمایا، عصر کی نماز پڑھ لو، ہم کھڑے ہوئے اور نمازِ عصر پڑھ لی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا

ہے کہ یہ منافق کی نماز (کی حالت) ہے کہ سورج کی انتظار میں بیٹھا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان میں آجاتا ہے تو کھڑا ہو کر چار ٹھونگیں لگاتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت تھوڑا کرتا ہے۔۔۔" (صحیح مسلم : ۲۲۵/۱، ح : ۶۲۲) ثابت ہوا کہ نمازِ عصر اول وقت ادا کرنی چاہیے، آج بھی اہل بدعت کی مساجد میں نمازِ عصر تاخیر سے پڑھی جاتی ہے۔

شبہ نمبر ① : سوار بن شبیب، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتے ہیں:

انّه كان يؤخّر العصر حتّى أقول : قد اصفرّت الشّمس .

"آپ رضی اللہ عنہ نمازِ عصر کو اتنا مؤخر کرتے کہ میں کہتا، سورج زرد ہو گیا ہے۔"

(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۳۲۷/۱، و سندہٗ صحیحٌ)

تبصرہ : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ گزر چکا ہے کہ عصر کا آخری وقت دو مثل تک ہے، جبکہ اس اثر میں مذکور زردی سے مراد دو مثل سے پہلے والی زردی ہے۔

شبہ نمبر ② : سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں آیا ہے:

انّه كان يؤخّر العصر . "آپ رضی اللہ عنہ نمازِ عصر کو مؤخر کرتے تھے۔"

(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۳۲۷/۱)

تبصرہ : اس کی سند ابو اسحاق السبیعی کی "تدلیس" کی وجہ سے "ضعیف" ہے۔

رشید احمد گنگوہی دیوبندی صاحب کہتے ہیں: "ایک مثل کا مذہب قوی ہے، لہٰذا ایک مثل پر عصر پڑھے تو ادا ہو جاتی ہے، اعادہ نہ کرے۔" (فتاوی رشیدیہ : ص ۲۸۵)

✵✵✵✵✵✵✵

اعتذار از ناشر

السنّۃ، شمارہ نمبر ⑲، صفحہ نمبر ⑥ اور ⑦ میں آیتِ کریمہ میں کمپوزنگ کی غلطی سے مِنَ الْجِنَّةِ کی بجائے مِنَ الْجَنَّةِ۔ صفحہ نمبر ⑦ اور ⑧ میں آیتِ کریمہ میں وَرَاءِ حِجَابٍ کی بجائے وَرَاءِ حَجَابٍ اور يُرْسِلَ کی بجائے يُرْسِلِ ۔ صفحہ نمبر ㉔ پر سطر نمبر ⑰ میں "دودھ نہ پلانا متعین ہے۔" کی بجائے "دودھ پلانا متعین ہے۔" اسی طرح صفحہ نمبر ۴۸ پر آیتِ کریمہ میں مِنْ نَّجْوٰی کی بجائے مَنْ نَجْوٰی شائع ہو گیا ہے۔ قارئین کرام تصحیح فرمالیں!

اسلاف پرستی ہی بت پرستی ہے، دنیا میں شرک، اولیاء وصلحاء کی محبت وتعظیم میں غلو کے باعث پھیلا، جیسا کہ امامِ بریلویت احمد رضا خان (۱۸۵۶۔۱۹۲۱ء) اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہوئے کہ ''بت پرستی کا آغاز تعظیم سے ہوا'' لکھتے ہیں:

''دنیا میں بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ صالحین کی محبت میں ان کی تصویریں بنا کر گھروں اور مسجدوں میں تبرکاً رکھیں اور ان سے لذتِ عبادت کی تائید سمجھی، شدہ شدہ وہی معبود ہوگئیں۔ صحیح بخاری (۷۳۲/۲) وصحیح مسلم (صحیح مسلم میں یہ روایت نہیں ہے۔غ،م) میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیتِ کریمہ: ﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ .... وَنَسْرًا﴾ (کافروں نے کہا، ہرگز اپنے خداؤں کو نہ چھوڑو اور ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو بھی نہ چھوڑو)

کی تفسیر میں ہے: قال : كانوا اسماء رجال صالحين من قوم نوح ، فلمّا هلكوا أوحى الشّيطان إلى قومهم أن نصبوا إلى مجالسهم الّتى كانوا يجلسون أنصابا وسمّوها بأسمائهم ، ففعلوا ، فلم يعبد حتّى إذا هلك أولئك ونسخ العلم عبدت . ''حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، یہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم کے نیک اور پارسا لوگوں کے نام ہیں، جب وہ وفات پاچکے تو شیطان نے بعد والوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ جہاں یہ لوگ بیٹھتے تھے، وہیں ان مجالس میں انہیں نصب کردو (یعنی قرینہ سے انہیں کھڑا کردو) اور جو نام ان کے (زندگی میں) تھے، وہی نام رکھ دو تو لوگوں نے (جہالت سے) ایسا ہی کیا، پھر کچھ عرصہ ان کی عبادت نہ ہوئی، یہاں تک کہ جب وہ تعظیم کرنے والے مرگئے اور علم مٹ گیا (اور ہر طرف جہالت پھیل گئی) تو پھر ان کی عبادت شروع ہوگئی۔'' (فتاوی رضویه : ۵۷۳/۲۴)

حافظ ابنِ حجر العسقلانی رحمہ اللہ (۷۷۳۔۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:

وقصّة الصّالحين كانت مبدأ عبادة قوم نوح هذه الأصنام ، ثمّ تبعهم من بعدهم

علـــى ذلك . ”نیک لوگوں (کی تعظیم) کا قصہ ہی قومِ نوح کے ان بتوں کی عبادت کرنے کا نقطۂ آغاز تھا، پھر بعد والے ان کے پیچھے لگ گئے۔“ (فتح الباری لابن حجر : ٦٦٩/٨)

سورۂ نوح کی آیت نمبر ٢٣ کی تفسیر میں امام قتادہ بن دعامہ تابعی رحمہ اللہ (م ١١٧ یا ١١٨ھ) فرماتے ہیں: **كانت آلهة يعبدها قوم نوح ، ثمّ عبدت العرب بعد ذلك .**

”یہ معبودانِ باطلہ تھے، جن کی عبادت قومِ نوح کرتی تھے، پھر اس کے بعد عربوں نے ان کی عبادت شروع کر دی۔“ (تفسیر ابن جریر : ٦٤٠/٢٣، وسندهٗ صحيحٌ)

عربوں میں بت پرستی کا رجحان اسی بنا پر پیدا ہوا، جیسا کہ عظیم تابعی امام مجاہد بن جبر رحمہ اللہ (م ١٠٤ھ) ﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اللّات يلتّ السّويق للحاجّ . ”لات حاجیوں کے لیے ستو بھگویا کرتا تھا۔“

(تفسیر ابن جریر : ٥٢٣/٢٢، وسندهٗ حسنٌ)

نیز فرماتے ہیں: **كان يلت السّويق للحاجّ ، فعكف على قبره .**

”لات حاجیوں کے لیے ستو گھولا کرتا تھا، چنانچہ (اس کی اس نیکی کی تعظیم میں) اس کی قبر پر اعتکاف کیا جانے لگا۔“ (تفسیر ابن جریر : ٥٢٣/٢٢، وسندهٗ صحيحٌ)

واضح ہوا کہ لات و عزیٰ نیک بزرگ تھے، مرنے کے بعد ان کی عبادت شروع ہو گئی، ان کے ناموں پر بتوں کے نام رکھ لیے گئے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی کچھ یونہی ہوا کہ بزرگوں کی محبت و تعظیم میں اس قدر غلو سے کام لیا گیا کہ جس طرح ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کے ناموں پر بت گھڑ لیے، جیسے رام چندر، ہنومان، کرشن، پاربتی سیتا اور گوتم بدھ وغیرہ، اسی طرح مسلمانوں نے اپنے بزرگوں کی قبروں پر قبے سجا کر ان کی عبادت شروع کر دی۔

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ اس بات کی یوں نشاندہی کرتے ہیں:

إنّ تلك الأسماء وقعت إلى الهند ، فسمّوا بها أصنامهم .

”(قومِ نوح کی پیروی میں) یہ نام ہندوستان میں بھی وقوع پذیر ہوئے، ہندوستانیوں نے بھی اپنے بتوں اور مقبروں کے نام قومِ نوح کی طرح رکھ لیے۔“ (فتح الباری لابن حجر : ٦٦٨/٨)

بزرگوں کی تعظیم میں غلو کے حوالے سے مشرکینِ ہند کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

① امامِ بریلویت احمد رضا خان بریلوی لکھتے ہیں:

''اولیاء بعد انتقال بھی دنیا میں تصرف فرماتے اور مشکلیں حل کرتے ہیں۔''

(الامن والعلی از احمد رضا خان : ص ٣٦)

② نیز کہتے ہیں: ''مزارات اولیائے کرام کے پاس ان کی روحِ مبارک کی تعظیم کے لیے چراغ جلانا بلا شبہ جائز و مستحسن ہے۔'' (فتاوی افریقه از احمد رضا خان : ص ٧٣)

③ احمد یار خان نعیمی بریلوی لکھتے ہیں: ''اس سے معلوم ہوا کہ اگر حضور غوث پاک نے بارہ برس کی ڈوبی ہوئی برات کو زندہ فرمایا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، اس دولہا کی قبر گجرات، پنجاب میں ہے، اس کا نام کبیر الدین ہے اور شاہ دولہ کے نام سے مشہور ہیں۔ حضور غوث پاک کے خلیفہ ہیں، ان کی قبر شریف زیارت گاہِ خاص و عام ہے، ان کی عمر چھ سو برس ہوئی۔''

(تفسیر نور العرفان از نعیمی : ص ٨٨، سورت آل عمران ، تحت آیت : ٤٩)

④ امامِ بریلویت احمد رضا خان بریلوی لکھتے ہیں: ''حضرت سید عبدالوہاب اکابر اولیائے کرام میں سے ہیں، حضرت سیدی احمد بدوی کبیر کے مزار پر بہت بڑا ہجوم اور میلہ ہوتا تھا، اس مجمع میں چلے آتے تھے، ایک تاجر کی کنیز پر نگاہ پڑی، فوراً نگاہ پھیر لی، خیر نگاہ تو آپ نے پھیر لی، مگر وہ آپ کو پسند آئی، جب مزار شریف پر حاضر ہوئے، ارشاد فرمایا، عبدالوہاب وہ کنیز پسند ہے؟ عرض کی، ہاں! اپنے شیخ سے کوئی بات چھپانا نہ چاہیے، ارشاد فرمایا، اچھا ہم نے تم کو وہ کنیز ہبہ کی۔ اب آپ سکوت میں ہیں کہ کنیز تو اس تاجر کی ہے اور حضور ہبہ فرماتے ہیں۔ معاً وہ تاجر حاضر ہوا اور اس نے وہ کنیز مزارِ اقدس کی نذر کی، خادم کو ارشاد ہوا، انہوں نے آپ کو نذر کر دی، ارشاد فرمایا، عبدالوہاب اب وہ دیر کاہے کی، فلاں حجرہ میں لے جاؤ اور اپنی حاجت پوری کرو۔۔۔''

(ملفوظات از احمد رضا خان : حصه سوم ، ص : ٣٠٧)

ایسی خرافات سے ان لوگوں کی کتابیں اٹی پڑی ہیں۔

ہم بتا یہ رہے تھے کہ بزرگوں کی شان حد سے بڑھانا قبر پرستی کا باعث بنا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: **لمّا اشتکی النّبیّ صلّی اللّٰه علیه وسلّم ذکرت بعض نسائه کنیسة رأینها بأرض الحبشة یقال لها : ماریة ، وکانت أمّ سلمة وأمّ حبیبة رضی اللّٰه**

عنهما أتتا أرض الحبشة تذكرتا من حسنها وتصاوير فيها ، فرفع رأسه ، فقال : أولئک إذا مات منهم الرّجل الصّالح بنو علی قبره مسجدا ، ثمّ صوّروا فيه تلک الصّورة ، أولئک شرار الخلق عند اللّٰه .

''جب نبیٔ اکرم ﷺ بیمار ہوئے تو ان کی بعض بیویوں نے اس کنیسے کا ذکر کیا، جسے انہوں نے حبشہ کی زمین میں دیکھا تھا، اسے ماریہ کہا جاتا تھا، سیدہ امِ سلمہ اور سیدہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا کہ وہ حبشہ کے علاقے میں گئی تھیں، پھر انہوں نے اس کنیسے کے حسن اور اس میں موجود تصاویر کا تذکرہ کیا، اس پر آپ ﷺ نے سر مبارک اٹھایا اور فرمایا، جب ان لوگوں میں سے کوئی نیک شخص فوت ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے، پھر اس میں یہ تصویریں بناتے، یہی لوگ بدترین مخلوق ہیں۔'' (صحيح البخاری : ۱۳۴۱، صحيح مسلم : ۵۲۸/۱۶)

ملا علی قاری حنفی (م۱۰۱۴ھ) اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

والمعنی أولئک من أهل الكتاب أو من جماعة اليهود والنّصاری إذا مات فيهم الرّجل الصّالح أی من نبیّ أو ولیّ بنوا علی قبره مسجدا ، أی متعبدا ، ويسمّوه كنيسة ، ثمّ صوّروا أی صور الصّلحاء تذكيرا بهم ، ترغيبا فی العبادة لأجلهم ، ثمّ جاء من بعدهم فزيّن لهم أعمالهم وقال لهم : سلفكم يعبدون هذه الصّور ، فوقعوا فی عبادة الأصنام .

''مراد یہ ہے کہ وہ (نادان) لوگ اہل کتاب تھے یا یہود و نصاریٰ میں سے ایک گروہ تھا، جب ان میں سے کوئی نیک آدمی، یعنی کوئی نبی یا کوئی ولی فوت ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے، یعنی معبد قائم کرتے اور اس کا نام کنیسہ رکھتے تھے، پھر نیک لوگوں کی تصویریں بنا کر رکھتے تا کہ ان کی یاد آتی رہے اور ان کے ذریعے عبادت میں رغبت پیدا ہو، پھر ان کے بعد والے لوگ آئے تو شیطان نے ان کے لیے پہلوں کے کارنامے مزین کر دیئے اور ان سے کہا کہ تمہارے اسلاف تصویروں کی پرستش کیا کرتے تھے تو پھر یہ لوگ ان کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔''

(مرعاة المفاتيح لملا علی القاری الحنفی : ۲۸۲/۸)

یعنی بزرگوں کی حد درجہ تعظیم ان کے مرنے کے بعد ان کی تصویریں بنانے کا باعث بنی۔ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد ان کی قبر پرستی شروع ہو گئی، ایک وقت کے بعد ان کے بت گھڑے گئے۔

معلوم ہوا کہ قبر پرستی ہی بت پرستی ہے، شروع سے لے کر اب تک انسانوں میں شرک اسی طریقہ سے پھیلا۔

تنبیہ بلیغ : بعض الناس یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اب امت میں شرک نہیں آ سکتا، اس کے ثبوت پر وہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں، سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **وإنّي واللّٰه ! ما أخاف عليكم أن تشركوا بعدي .**

''اللہ کی قسم! میں تم پر اس بات کا خوف نہیں کرتا کہ تم میرے بعد شرک کرو گے۔''

(صحيح البخاری : ١٣٤٤، صحيح مسلم : ٢٢٩٦)

تبصرہ : ① یہ انتہائی گمراہ کن نظریہ ہے۔ یہ خالص برصغیر پاک وہند کی پیداوار ہے، کسی مسلمان نے اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت نہیں کیا کہ اب امت میں شرک نہیں آ سکتا، دراصل یہ بت پرستی کی حوصلہ افزائی ہے اور حدیث کی معنوی تحریف ہے، اور مسلمانوں کے اجماعی نظریہ کی خلاف ورزی ہے۔

② اس حدیثِ مبارکہ میں یہ خطاب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہے، فی الواقع ایسا ہوا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شرک نہیں کیا، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان برحق ہے۔

③ اس حدیث کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ مجھے ساری کی ساری امت کے مشرک ہوجانے کا ڈر نہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ گرامی سے ثابت ہے کہ بعض گروہ شرک میں مبتلا ہوجائیں گے، جیسا کہ:

(ا) سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ولا تقوم السّاعة حتّى تلحق قبائل من أمّتي بالمشركين وحتّى تعبد قبائل من أمّتي الأوثان . ''اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی، جب تک میری امت کے چند قبائل مشرکوں کے ساتھ نہیں مل جائیں گے اور جب تک چند قبائل قبروں کی پوجا شروع نہیں کر دیں گے۔'' (صحيح مسلم : ١٤٣/٢، ح : ١٩٢٠ مختصرا، مسند الامام احمد : ٥/ ٢٧٨، سنن ابی داوٗد : ٤٢٥٢، سنن الترمذی : ٢١٢٩، وقال : صحيح، سنن ابن ماجه : ٣٩٥٢)

(ب) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تقوم السّاعة حتّی تضطرب ألیات نساء دوس علی ذی الخلصة .

''اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی ، جب تک دوس قبیلہ کی عورتوں کی سرینیں ذی الخلصہ (بت) کے اردگرد چکر نہ لگائیں گے۔'' (صحیح البخاری : ۷۱۱۶، صحیح مسلم : ۲۹۰۶)

امامِ بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں باب قائم فرمایا ہے:

باب تغییر الزّمان حتّی تعبد الأوثان . ''اس بات کا بیان کہ زمانہ ایسی کروٹ لے گا کہ بتوں کی پوجا شروع ہو جائے گی۔''

لیکن ہمارے دور کے مشرکین کہتے ہیں کہ شرک کا مسئلہ ہی ختم ہو گیا ہے!

اب اس حدیث کے متعلق علمائے کرام کی آراء ملاحظہ فرمائیں:

① حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (۷۷۳۔۸۵۲ھ) لکھتے ہیں: **أی : لا أخاف علی مجموعکم ، لأنّ الشّرک قد وقع من بعض أمّته بعده صلّی اللّٰه علیه وسلّم .**

''مراد یہ ہے کہ میں تم سب پر شرک کا خوف نہیں کرتا ، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت کے بعض افراد سے شرک کا صدور ہوا ہے۔'' (فتح الباری لابن حجر : ۲۱۱/۳)

② ابن العراقی رحمہ اللہ (م۸۲۶ھ) لکھتے ہیں: **أی : مجموعکم ، وإن کان قد یقع ذلک لبعضهم .** ''یعنی تم سب مل کر شرک پر جمع نہیں ہو جاؤ گے ، اگرچہ مسلمانوں میں سے بعض لوگ اس میں مبتلا ہو جائیں گے۔'' (طرح التثریب لابن العراقی : ۳۰۱/۴)

③ علامہ عینی حنفی (۷۶۲۔۸۵۵ھ) لکھتے ہیں: **معناه : علی مجموعکم ، لأنّ ذلک قد وقع من البعض .** ''اس کا معنیٰ یہ ہے کہ میں تم سب کے شرک میں پڑنے سے نہیں ڈرتا ، کیونکہ بعض سے ایسا واقع ہو گیا ہے۔'' (عمدة القاری : ۴۹۱/۱۲)

④ ملا علی القاری حنفی ماتریدی لکھتے ہیں: **أی : علی مجموعکم أن تشرکوا بعدی ، لأنّ ذلک قد وقع من بعض .** ''اس کا معنیٰ یہ ہے کہ میں تم سب کے شرک میں پڑنے سے نہیں ڈرتا ، کیونکہ بعض سے ایسا واقع ہو گیا ہے۔''

(مرقاة المفاتیح : باب فی بیان هجرة اصحابه من مکة)

اب ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں کہ بزرگوں کی تعظیم بت پرستی کا باعث بنی ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللّٰھمّ لا تجعل قبری وثنا ، لعن اللّٰہ قوما اتّخذوا قبور أنبیائھم مساجد .

''اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنا دینا، اللہ تعالیٰ ان قوموں پر لعنت کرے، جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا۔'' (مسند الحمیدی : ۱۰۲۵، مسند الامام احمد : ۲/۲۴۶، التاریخ الکبیر للبخاری : ۳/۴۷، وسندہٗ حسنٌ)

اس کے راوی سہیل بن ابی صالح کے متعلق حافظ منذری رحمہ اللہ (۶۵۶ھ) لکھتے ہیں:

وثّقه الجمھور . ''اسے جمہور نے ثقہ کہا ہے۔'' (الترغیب والترهیب : ۳/۱۱۰)

بوصیری کہتے ہیں: **رجاله ثقات .** ''اس کے راوی ثقہ ہیں۔''

(اتحاف المهرة : ۴/۱۶۴)

ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں: **أی : لا تجعل قبری مثل الوثن فی تعظیم النّاس ، وعودھم للزّیارة بعد بدئھم واستقبالھم نحوه فی السّجود ، کما نسمع ونشاھد الآن فی بعض المزارات والمشاھد .** ''یعنی (اے اللہ!) میری قبر کو بت کی طرح نہ بنا دینا کہ جس طرح لوگ بتوں کی تعظیم کرتے اور بار بار ان کی زیارت کرتے ہیں اور سجدوں میں اس کی طرف توجہ کرتے ہیں، جیسا کہ ہم اب ہم بعض مزارات ومشاہد میں دیکھتے ہیں۔''

(مرقاة الفاتیح لملا علی القاری الحنفی : ۲/۴۵۸)

حافظ الاندلس امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ (۳۶۸۔۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

الوثن : الصّنم ، وھو الصّورة من ذھب کان أو من فضّة ، أو غیر ذلک من التّمثال ، وکلّ ما یعبد من دون اللّٰہ فھو وثن ، صنما کان أو غیر صنم ، وکانت العرب تصلّی إلی الأصنام وتعبدھا ، فخشی رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم علی أمّته أن تصنع کما صنع بعض من مضی من الأمم ، کانوا إذا مات لھم نبیّ عکفوا حول قبره ، کما یصنع بالصّنم ، فقال صلّی اللّٰہ علیه وسلّم : اللّٰھمّ لا تجعل قبری وثنا ، یصلّی إلیه ویسجد نحوه ، ویعبد ، فقد اشتدّ غضب اللّٰہ علی من فعل ذلک ، وکان رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم یحذر أصحابه وسائر أمّته من سوء صنیع

الأمم قبله الّذين صلّوا إلى قبور أنبيائهم ، واتّخذوا قبلة ومسجدا ، كما صنعت الوثنيّة بالأوثان الّتى كانوا يسجدون لها ويعظّمونها ، وذلك الشّرك الأكبر ، فكان النّبيّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم يخبرهم بما فى ذلك من سخط اللّٰه وغضبه ، وأنّه ممّا لا يرضاه خشية عليهم امتثال طرقهم .

''وثن ، بت کو کہتے ہیں اور بت سونے یا چاندی وغیرہ کی مورتی ہوتی ہے، اسی طرح ہر وہ چیز جس کی اللہ تعالیٰ کے علاوہ پوجا کی جائے ، وہ بت ہو یا کوئی اور چیز اسے وثن کہا جاتا ہے، عرب لوگ بتوں کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کرتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے ڈر محسوس کیا کہ ان کی امت اسی طرح نہ کرنے لگے، جس طرح گزری ہوئی امتوں نے کیا تھا، وہ یوں کرتے تھے کہ جب ان کا کوئی نبی فوت ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر وہی کام کرتے تھے، جس طرح بت پرست اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں، اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا دینا کہ اس کی طرف نماز پڑھی جائے اور سجدے کیے جائیں اور اس کی عبادت کی جائے۔ جن لوگوں نے ایسا کیا تھا، ان پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہوا تھا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ اور باقی امت کو ان لوگوں کی بری کرتوتوں سے بچنے کا حکم دیتے تھے، جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھی تھیں اور ان قبروں کو قبلہ اور مسجد بنا لیا تھا، جیسا کہ بت پرستوں نے اپنے ان بتوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا تھا، جن کو وہ سجدے کرتے تھے اور جن کی وہ تعظیم کرتے تھے، یہی شرکِ اکبر ہے۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو ان کاموں میں موجود اللہ تعالیٰ کی ناراضی ، غضب کی خبر دے رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ یہ کام ایسے ہیں کہ جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پسند نہیں کرتے ، اس ڈر سے کہ کہیں وہ سابقہ امتوں کے نقشِ قدم پر ہی نہ چل نکلیں۔'' (التمهيد لابن عبد البر : ٥/٤٥، تحقيق سعيد احمد اعراب)

سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لعنة اللّٰه على اليهود والنّصارى ، اتّخذوا قبور أنبيائهم مساجد ، يحذّر ما صنعوا .

''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس فعل سے بچنے کی ترغیب دے رہے تھے۔''

(صحيح البخارى : ٤٣٥، ٤٣٦، صحيح مسلم : ٥٣١)

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وکأنّہ أنہ مرتحل ، فخاف أن یعظّم قبرہ ، کما فعل من مضی ، فلعن الیہود والنّصاری إشارۃ إلی ذمّ من فعل فعلھم . ''گویا کہ آپ اس دنیا سے کوچ کرنے والے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قبر کی تعظیم کا خوف پیدا ہوا، جیسا کہ پہلے لوگ کرتے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود و نصاریٰ پر لعنت کی، یہ اشارہ کرنے کے لیے کہ جو شخص ان کی طرح کا کام کرے گا وہ مذموم ہوگا۔'' (فتح الباری لابن حجر : ۵۳۲/۱)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تتّخذوا بیوتکم قبورا ، ولا تجعلوا قبری عیدا ، وصلّوا علیّ ، فإنّ صلاتکم تبلغنی حیث کنتم . ''تم اپنے گھروں کو قبریں مت بناؤ اور میری قبر کو میلہ گاہ مت بناؤ، بلکہ (دور سے ہی) مجھ پر درود پڑھ دیا کرو، کیونکہ تمہارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے، تم جہاں بھی ہوتے ہو۔'' (مسند الامام احمد : ۳۶۷/۲، سنن ابی داوٗد : ۲۰۴۱، واللفظ لہ، وسندہٗ حسنٌ)

علامہ مناوی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

معناہ النّھی عن الاجتماع لزیارتہ اجتماعھم للعید ، إمّا لرفع المشقّۃ ، أو کراھتہ أن یتجاوزوا حدّ التّعظیم . ''اس کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ کی قبر کی زیارت کے لیے اجتماع منع ہے، جیسا کہ عید کے لیے اجتماع ہوتا ہے، یا تو مشقت کو ختم کرنے کے لیے یا پھر اس چیز کو ناپسند کرتے ہوئے کہ وہ تعظیم کی حد سے آگے نہ نکل جائیں۔'' (عون المعبود : ۳۲/۶۔۳۳)

علامہ طیبی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''آپ نے لوگوں کو اپنی قبر پر اس طرح جمع ہونے سے منع فرمایا، جس طرح کہ عید کے موقع پر سیر و تفریح اور زینت کے ساتھ جمع ہوا جاتا ہے۔ یہود و نصاریٰ اپنے انبیاء کی قبروں پر ایسا کرتے تھے، اس چیز نے ان کو غافل اور سخت دل بنا دیا۔ بت پرستوں کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ اپنے مردوں کی تعظیم کرتے رہے، حتی کہ انہوں نے ان کو بت بنالیا، اسی طرف فرمانِ نبوی میں اشارہ ہے کہ اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا دینا کہ اس کی عبادت کی جائے، اس ممانعت سے مقصود اس ناپسندیدگی کا اظہار ہے کہ لوگ آپ کی قبر کے بارے میں حد درجہ غلو نہ کرنے لگیں، اسی لیے فرمایا کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا سخت

غضب ہوا، جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔" (مرقاۃ المفاتیح للقاری : ۱٤/۳)

آج بھی لوگ قبروں میں مدفون اولیاء وصلحاء کو سجدہ کرتے ہیں، ان کو داتا، دستگیر، فریادرس، غوثِ اعظم، غریب نواز، وغیرہ کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ ان سے مدد طلب کرتے ہیں، ان کے نام پر نذر و نیاز دیتے ہیں، دیگیں پکاتے ہیں، چڑھاوا اور ڈولی چڑھاتے ہیں، ان کے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں، بچوں کے سر پر ان کے نام کی چوٹی رکھتے ہیں، کڑے پہنتے ہیں، دودھ کی سبیلیں لگاتے ہیں، کھانا تقسیم کرتے ہیں، ان کی قبر کے سامنے تعظیماً کھڑے ہوجاتے ہیں، مجاوری اختیار کرتے ہیں، ان کو نفع ونقصان کا مالک اور صاحبِ تصرف سمجھتے ہیں، دور یا نزدیک سے ان کو پکارتے اور مشکل میں ان کے نام کی دہائی دیتے ہیں، اولاد اور حاجات طلب کرتے ہیں، ان کو روزی رساں اور عزت وذلت کا مالک سمجھتے ہیں، ان سے شفا کی امید رکھتے ہیں، پریشانی، دکھ اور تکلیف میں ان سے شکایت کرتے ہیں، ان کی قبر کا طواف، چلہ کشی اور مراقبے کرتے ہیں۔ یہ عقیدۂ بد بھی رکھتے ہیں کہ اگر نذرانہ پیش نہ کیا تو کاروبار میں نقصان اور مقدمے میں شکست ہوسکتی ہے۔ حصولِ برکت کے لیے قبر کے ساتھ جسم رگڑتے ہیں۔ صاحبِ قبر کی عقیدت میں ننگے پاؤں چل کر حاضری دیتے ہیں، گھروں، دوکانوں اور فیکٹریوں میں ان کی تصاویر آویزاں کرتے ہیں، ان کی قبر کو تریاقِ مجرب کا نام دیتے ہیں۔

ان شرکیہ عقائد واعمالِ سیئہ کے ساتھ ظلمات بعضہا فوق بعض، بدعات، خرافات، ہفوات، بیسیوں محرمات اور منکرات نے جنم لیا ہے، مثلاً اولیاء وصالحین کی قبروں کو پختہ کرنا، مخصوص رنگ کے قبے اور گنبد بنانا، ان کے وسیلے سے دعا کرنا، قبر کی مٹی کو خاکِ شفا اور پتھروں کو متبرک اور نافع سمجھنا، قبر کو خلافِ شرع بلند کرنا، اس کو چونا گچ کرنا، اس پر کتبہ لگانا اور خیمہ گاڑنا، شرکیہ اشعار اور مرثیے لکھنا، قبر کے اردگرد فصیل قائم کرنا، قبر کے قرب میں مسجد تعمیر کرنا، قبر پر غلاف اور چادریں چڑھانا، اگربتیاں جلانا، موم بتیاں اور چراغ روشن کرنا، برقی پنکھے چلانا، خوشبو چھڑکنا، پھول ڈالنا، جھنڈے گاڑنا، قبر کی تعظیم میں الٹے پاؤں چلنا، اس کی طرف پیٹھ نہ کرنا، قبر کو چومنا اور اس کا بوسہ لینا، اس کی طرف سفر کا قصد کرنا، ذکر کی مجالس ومحافل، شب بیداری، اجتماعی نوافل، اجتماعی قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کا اہتمام کرنا۔ بزرگوں کے بارے میں جھوٹے قصے، کہانیاں، جھوٹی کرامات اور روایات بیان کرنا۔ بزرگوں کی روحوں کو حاضر وناظر سمجھنا وغیرہ۔۔۔

سوال : کیا بالوں کو رنگنا ضروری ہے؟

جواب : سلف صالحین کی ایک جماعت سے داڑھی کو نہ رنگنا بھی ثابت ہے، جیسا کہ:

① امام شعبی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے؟ تو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا: **رأيته أبيض الرّأس واللّحية .**

''میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کا سر اور داڑھی سفید تھے۔''

(المستدرك على الصحيحين للحاكم : ٣٦٥/٤، وسندهٗ صحيح متصل)

امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **وهذا إسناد صحيح .** ''اس کی سند صحیح ہے۔''

نیز حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اسے ''صحیح'' کہا ہے۔

② سید اہل الجزیرہ امام عدی بن عدی رحمہ اللہ (م ۱۲۰ھ) فرماتے ہیں:

رأيت جابر بن عبد الله أبيض الرّأس واللّحية . ''میں نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ کا سر سفید تھا اور داڑھی بھی سفید تھی۔''

(مسند علی بن الجعد : ٣٣٣٣، وسندهٗ صحيحٌ)

③ ابو مودود عبدالعزیز بن ابی سلیمان المدنی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

رأيت السّائب بن يزيد أبيض الرّأس واللّحية . ''میں نے سیدنا سائب ابن یزید (صحابیٔ رسول رضی اللہ عنہ) کو دیکھا، آپ کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے (یعنی وہ خضاب نہیں لگایا کرتے تھے)۔'' (مصنف ابن ابی شیبۃ : ٤٤٥/٨، وسندهٗ صحيحٌ)

④ الاحنف بن قیس ابو بحر التمیمی رحمہ اللہ (م ٦٧ھ، وقیل ٧٢ھ) بیان کرتے ہیں:

قدمت المدينة ، فدخلت مسجدها ، فبينا أنا أصلّي إذ دخل رجل طويل ، آدم ، أبيض اللّحية والرّأس ، محلوق ، يشبه بعضه بعضا ، فخرجت فاتّبعته ، فقلت : من هذا ؟ قالوا : أبو ذرّ . ''میں مدینہ پہنچا، اس کی مسجد میں داخل ہوا، میں نماز پڑھ رہا تھا

کہ اچانک ایک دراز قد آدمی نمودار ہوا، اس کا رنگ گندمی تھا، داڑھی سفید تھی اور سر مونڈا ہوا تھا، اس کا بعض حصہ بعض سے مشابہ تھا، میں نکل کر اس کے پیچھے چل دیا، میں نے لوگوں سے پوچھا، یہ کون ہیں؟ انہوں نے بتایا، یہ (صحابیٔ رسول سیدنا) ابوذر رضی اللہ عنہ ہیں۔"

(مصنف ابن ابی شیبة : ٤٤٥/٨، المعرفة والتاریخ للفسوی : ٢٠٦/١، وسندہٗ صحیحٌ)

⑤ سیار بن سلامہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: **رأیت أبا برزة أبیض الرّأس واللّحیة .** "میں نے ابو برزہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔"

(الطبقات الکبرٰی لابن سعد : ٢٩٩/٤، ١٩/٧، وسندہٗ حسنٌ)

⑥، ⑦ فطر بن خلیفہ رحمہ اللہ (م ۱۵۳ھ) بیان کرتے ہیں: **رأیت مجاھدا شدید بیاض الرّأس واللّحیة ، ورأیت سعید بن جبیر أبیض اللّحیة .**

"میں نے امام مجاہد بن جبر تابعی رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کے سر اور داڑھی کے بال انتہائی سفید تھے اور میں نے امام سعید بن جبیر تابعی رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کی داڑھی سفید تھی۔"

(مصنف ابن ابی شیبة : ٤٤٥/٨، وسندہٗ صحیحٌ)

⑧ خالد بن ابی عثمان رحمہ اللہ کہتے ہیں: **رأیت سعید بن جبیر أبیض اللّحیة ، ورأیت طاؤوسا أبیض اللّحیة .** "میں نے امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور امام طاؤس بن کیسان تابعی رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کی داڑھی سفید تھی۔"

(مصنف ابن ابی شیبة : ٤٤٦/٨، وسندہٗ صحیحٌ)

⑨ عبدالحمید بن بہرام رحمہ اللہ کہتے ہیں: **رأیت عکرمة أبیض اللّحیة .**

"میں نے عکرمہ (مولیٰ ابنِ عباس) کو دیکھا، آپ کی داڑھی سفید تھی۔"

(تاریخ بغداد للخطیب : ٤٩/٥، وسندہٗ صحیحٌ)

⑩ فطر رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: **رأیت الحکم أبیض اللّحیة .**

"میں نے حکم بن عتیبہ تابعی رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کی داڑھی سفید تھی۔"

(الطبقات الکبرٰی لابن سعد : ٣٣١/٦، وسندہٗ صحیحٌ)

⑪ فطر رحمہ اللہ ہی بیان کرتے ہیں: **رأیت علیّ بن ربیعة أبیض اللّحیة .**

''میں نے علی بن ربیعہ تابعی رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کی داڑھی سفید تھی۔''

(الطبقات الکبرٰی لابن سعد : ٦/٢٢٦، وسندہٗ صحیحٌ)

⑫ عبداللہ بن اجلح رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: **ورأیت عطاء بن السّائب أبیض اللّحیة .** ''میں نے عطاء بن السائب کو دیکھا، ان کی داڑھی سفید تھی۔''

(المعرفة والتاریخ لیعقوب بن سفیان الفسوی : ١/٣٣٥، وسندہٗ صحیحٌ)

⑬ نیز فرماتے ہیں: **ورأیت خصیفا أبیض الرّأس واللّحیة .** ''میں نے خصیف کو دیکھا، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔''

(المعرفة والتاریخ للفسوی : ١/٣٥٥، وسندہٗ صحیحٌ)

⑭ نیز بیان کرتے ہیں: **رأیت سلمة بن کھیل أبیض الرّأس واللّحیة ، لا یخضب .** ''میں نے سلمہ بن کہیل رحمہ اللہ کو دیکھا، آپ کا سر اور داڑھی دونون سفید تھے، آپ خضاب نہیں لگاتے تھے۔'' (المعرفة والتاریخ للفسوی : ١/٣٣٤، وسندہٗ صحیحٌ)

⑮ المستمر بن الریان الزہرانی کہتے ہیں: **رأیت جابر بن زید أبیض اللّحیة .** ''میں نے امام جابر بن زید رحمہ اللہ (تابعی) کو دیکھا کہ آپ کی داڑھی سفید تھی۔''

(مصنف ابن ابی شیبة : ٨/٤٤٥، وسندہٗ صحیحٌ)

⑯ ابوالغصن ثابت بن قیس رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ: **أنّه رأی سعید بن المسیّب أبیض الرّأس واللّحیة .** ''انہوں نے امام سعید بن مسیّب تابعی رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔'' (الطبقات الکبرٰی لابن سعد : ٥/١٤٠، وسندہٗ حسنٌ)

⑰ فطر بیان کرتے ہیں: **رأیت سالما أبیض الرّأس واللّحیة.** ''میں نے سالم رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔''

(الطبقات الکبرٰی لابن سعد : ٥/١٩٧، وسندہٗ صحیحٌ)

یہی بات ابوالغصن نے بیان کی ہے۔(الطبقات الکبرٰی لابن سعد : ٥/١٩٧، وسندہٗ حسنٌ)

⑱ ابوبکر بن شعیب بن الحبحاب رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: **رأیت أبا صادق أبیض الرّأس واللّحیة .** ''میں نے امام ابوصادق رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کا سر اور داڑھی

دونوں سفید تھے۔'' (الطبقات الکبریٰ لابن سعد : ۲۹۵/۶، وسندہٗ حسنٌ)

⑲ جریر بن حازم رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: **رأيت أبا رجاء أبيض الرّأس واللّحية .** ''میں نے ابورجاء کو دیکھا کہ ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔''

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد : ۱۳۹/۷، وسندہٗ صحیحٌ)

⑳ عطاء بن السائب رحمہ اللہ کہتے ہیں: **أوّل يوم عرفت فيه عبد الرّحمن ابن أبي ليلى ، رأيت شيخا أبيض الرّأس واللّحية على حمار ، وهو يتبع جنازة .**

''پہلے دن جب میں نے امام عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ کو دیکھا تو وہ بوڑھے تھے، ان کا سر اور داڑھی سفید تھے، وہ ایک گدھے پر سوار ہو کر جنازے کے پیچھے جارہے تھے۔''

(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۱۰۹/۱٤، وسندہٗ صحیحٌ)

㉑ امام ابراہیم بن سعید الجوہری رحمہ اللہ، عبداللہ بن محمد بن الاسود رحمہ اللہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں: **رأيته لا يخضب أبيض الرّأس واللّحية .**

''میں نے ان کو دیکھا کہ وہ خضاب نہیں لگاتے تھے، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔''

(تاریخ بغداد للخطیب : ۳۳۹/٤، وسندہٗ صحیحٌ)

㉒ نیز ابومسعر عبدالاعلیٰ کے بارے میں کہتے ہیں: **وكان أبيض الرّأس واللّحية ، وكان لا يخضب .** ''ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے، وہ خضاب نہیں لگاتے تھے۔'' (تاریخ بغداد للخطیب : ۵٦/۵، وسندہٗ صحیحٌ)

㉓ امام محمد بن اسحاق السراج رحمہ اللہ، ابوعمرو الجہضمی کے بارے میں کہتے ہیں:

رأيته ، وكان لا يخضب ، أبيض الرّأس واللّحية .

''میں نے ان کو دیکھا، وہ خضاب نہیں لگاتے تھے، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔''

(تاریخ بغداد للخطیب : ۷۹/٦، وسندہٗ صحیحٌ)

㉔ امام ابراہیم بن سعید الجوہری اور اسماعیل بن ابی الحارث کہتے ہیں:

رأينا الهيثم بن خارجة أبا أحمد أبيض الرّأس واللّحية .

''ہم نے ابواحمد ہیثم بن خارجہ رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔''

(تاریخ بغداد للخطیب : ۱۹۶/۶، وسندہٗ صحیحٌ)

فائدہ نمبر ① : سیدنا عثمان بن عبداللہ بن موہب بیان کرتے ہیں:

دخلت علی أمّ سلمة ، فأخرجت إلینا شعرا من شعر النبیّ صلّی اللہ علیه وسلّم مخضوبا .

''میں سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا، آپ نے ہماری طرف نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں میں سے ایک بال نکالا، جو کہ خضاب شدہ تھا۔'' (صحیح البخاری : ۵۸۹۷)

سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: **أمّا الصّفرة ، فإنّی رأیت رسول اللہ صلّی اللہ علیه وسلّم یصبغ بھا ، فأنا أحبّ أن أصبغ بھا .** ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (داڑھی کو) سرخ رنگ کا خضاب لگاتے تھے، لہٰذا میں بھی اسی رنگ کو پسند کرتا ہوں۔''

(صحیح البخاری : ۵۸۵۱، صحیح مسلم : ۱۱۸۷)

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند بال مبارک سفید بھی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سرخ یا زرد خضاب بھی لگاتے تھے، جبکہ ایک روایت میں ہے، امام قتادہ تابعی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

سألت أنسا : ھل خضب النبیّ صلّی اللہ علیه وسلّم ؟ قال : لا ، إنّما کان شیء فی صدغیه .

''میں نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خضاب لگاتے تھے تو انہوں نے جواب دیا نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنپٹیوں پر چند بال سفید تھے۔''

(صحیح البخاری : ۵۸۹۵، صحیح مسلم : ۲۳۴۱)

ان احادیث میں جمع و تطبیق یوں ہوگی کہ بعض اوقات نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خضاب لگانا بیانِ جواز واستحباب کے لیے تھا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوام و ہمیشگی نہیں کی اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی نفی اکثر اوقات پر محمول ہے۔ (دیکھیں فتح الباری لابن حجر : ۵۷۲/۵، ۳۵۴/۱۰، شرح صحیح مسلم للنووی : ۲۵۹/۲، زاد المعاد لابن القیم : ۳۶۷/۴)

فائدہ نمبر ② : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا: إنّ الیھود والنّصاری لا یخضبون ، فخالفوھم .

''یہود ونصاریٰ بالوں کونہیں رنگتے ،تم (بالوں کورنگ کر) ان کی مخالفت کرو۔''

(صحیح البخاری : ۵۸۹۹، صحیح مسلم : ۲۱۰۳)

ایک روایت میں ہے: غیّروا الشّیب ، ولا تشبّھوا بالیھود .

''تم اپنے بالوں کورنگا کرو، یہودیوں کے ساتھ تشبیہ اختیار نہ کرو۔''

(سنن الترمذی : ۱۷۵۲، وقال : حسن صحیح ، وسندہٗ حسنٌ)

جب کوئی قرینہ صارفہ نہ پایا جائے تو یہود ونصاریٰ کی مخالفت واجب ہوتی ہے، جبکہ مذکورہ بالا احادیث وآثار میں اس بات کا قرینہ پایا جاتا ہے، جوکہ استحباب کی طرف رہنمائی کرتا ہے، یعنی داڑھی اورسر کے بالوں کورنگنا مستحب ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے خضاب کوترک کرنا بھی ثابت ہے، جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں۔

فائدہ نمبر ③ : سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے تو نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا:

غیّروا ھذا بشیء ، واجتنبوا السّواد . ''ان کوکسی رنگ سے رنگ دو، البتہ سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔'' (صحیح مسلم : ۱۹۹/۲، ح : ۲۱۰۲)

یہ حکم واجبی نہیں ، بلکہ استحبابی ہے، کیونکہ راویٔ حدیث سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے سر اور داڑھی کو نہ رنگنا اور سفید رکھنا ثابت ہے، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔

ان احادیث کے بارے میں محدثین کرام کا فہم وعمل یہ پتا دیتا ہے کہ بالوں کو رنگنا ضروری نہیں ہے، کسی محدث نے بالوں کو رنگنے کے بارے میں وجوب کا باب قائم نہیں کیا، خوب یاد رہے کہ محدثین کرام اپنی روایات کا مطلب دوسروں سے بہتر جانتے ہیں۔

کسی مستحب امر کے ساتھ وجوب کا معاملہ کرنا اسے بدعت بنا دیتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحابہ وتابعین اور محدثین کرام کے فہم وعمل کے مطابق دین پر عمل کرنے کی توفیق سے نوازے!

سوال : کیا صرف لفظِ ''اللہ'' ذکر ہے؟

جواب : فقط لفظِ اللہ ذکر نہیں ہے، بعض لوگ دن رات تسبیح پر ''اللہ، اللہ'' کا

ورد کرتے رہتے ہیں، جبکہ قرآن وحدیث میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ائمہ اہل سنت سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ بدعتِ قبیحہ اور سیئہ ہے۔ یہ وحدت الوجود کا نظریہ رکھنے والے جاہل، ملحد، گمراہ اور بے دین صوفیوں کا ذکر ہے۔

(دیکھیں مجموع الفتاوی لابن تیمیة : ۱/ ۲۲۵، ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۳، ۵۵۸، کتاب الرد علی المنطقیین لابن تیمیة : ۳۵)

اس کے باوجود حنفیوں، دیوبندیوں اور بریلویوں کے نزدیک یہ جائز ہے۔

(دیکھیں تاج التراجم لابن قطلوبغا الحنفی ، ملفوظات اشرفیه : ۱/ ۱۱۴، ۴۸۳، ۵۶۰، ۶۵۹، ۶۶۰، مجالس حکیم الامت : ۲۹۱، الکلام الحسن : ۲/ ۲۱۳، تذکرۃ الرشید از عاشق الهی دیوبندی : ۲/ ۲۵، العرف الشذی از انور شاہ کشمیری دیوبندی : ۲/ ۴۴)

اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ لوگ فلاسفہ کے نظریات سے کس طرح متفق ہیں۔ واضح رہے کہ اسی طرح ''یا ھو'' ''ھو إلا ھو'' اور ''ھو'' بھی ذکر نہیں ہے۔

ہمیں چاہیے کہ نبیٔ اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے اذکار پر اکتفا کریں، بہت سے اذکارِ مسنونہ کتبِ احادیث میں موجود ہیں، جو کہ صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

''بعض الناس'' نے اس مسئلہ کو قرآن وحدیث سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ فقط لفظِ ''اللہ'' کے ذکر ہونے کے ثبوت میں یہ آیتِ کریمہ پیش کرتے ہیں:

﴿ قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴾ (الانعام : ۹۱)

''آپ کہہ دیں کہ (جس نے کتاب نازل کی ہے، وہ) اللہ (ہے)، پھر آپ ان کو چھوڑ دیں کہ وہ اپنی سرگردانی میں کھیلتے پھریں۔''

حالانکہ اس آیت میں لفظِ ''اللہ'' سابقہ آیت میں موجود الفاظ ﴿ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ ﴾ (یہ کتاب، یعنی قرآن کس نے نازل کیا ہے؟) کے جواب میں ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں لفظِ ''اللہ'' مفرد نہیں ہے، بلکہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اس سے مفرد ذکر کہاں سے ثابت ہو گیا ہے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ائمہ اہل سنت نے اس آیت سے یہ مسئلہ ثابت نہیں کیا، لہٰذا یہ قرآنِ مقدس کی معنوی تحریف ہے، نیز یہ ''بعض الناس'' کی جہالت اور علمی بے بسی پر بین ثبوت ہے۔

اسی طرح وہ ایک حدیثِ مبارکہ سے بھی استدلال کرتے ہیں، وہ کچھ یوں ہے:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تقوم السّاعة ، حتّی لا یقال فی الأرض : اللّٰہ ، اللّٰہ .

''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی ، جب تک زمین میں اللہ، اللہ کہا جانا ختم نہ ہوجائے۔''

(صحیح مسلم : ۸٤/۱، ح : ۱٤۸)

اس حدیث سے استدلال باطل ہے، کیونکہ لفظِ ''اللہ'' کا تکرار تاکید کے لیے ہے، نہ کہ ذکر کے لیے۔ حافظ نووی رحمہ اللہ شرح کرتے ہوئے اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

أمّا معنی الحدیث فھو أنّ القیامة إنّما تقوم علی شرار الخلق ، کما جاء فی الرّوایة الأخریٰ . ''رہی حدیث کے معنیٰ کی بات تو وہ یہ ہے کہ قیامت بدترین لوگوں پر قائم ہوگی، جیسا کہ دوسری روایت میں موجود ہے۔'' (شرح مسلم للنووی : ٤۸/۱)

یعنی اہل توحید دنیا سے اٹھ جائیں گے، اللہ تعالیٰ کا نام لیوا کوئی نہیں ہوگا، خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا، اس طرح کے برے لوگوں پر قیامت برپا ہوگی۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ اس حدیث کا مطلب واضح کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

حتی لا یذکر اسم اللّٰہ ، ولا یعبد . ''حتی کہ اللہ کا نام نہیں لیا جائے گا، نہ ہی اس کی عبادت کی جائے گی۔'' (شرح الطیبی : ۱۰/۱٥٦)

الحاصل : فقط لفظِ ''اللہ'' ذکر نہیں ہے، بلکہ گمراہ صوفیوں کی ایجاد کردہ بدعت ہے۔

سوال : سجدہ کتنے اعضاء پر کرنا چاہیے؟

جواب : سات اعضاء، یعنی ماتھے بشمول ناک، دو ہاتھ، دو گھٹنے اور دو پاؤں پر سجدہ کرنا واجب ہے، جیسا کہ:

① سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أمرت أن أسجد علی سبعة أعظم ، علی الجبھة ، وأشار بیدہ إلی أنفه ، والیدین ، والرّکبتین ، وأطراف القدمین ... ''مجھے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) حکم

دیا گیا ہے کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کروں، ماتھے پر، آپ نے اپنے ہاتھ کے ساتھ ناک کی طرف اشارہ فرمایا، دونوں ہاتھوں، دونوں گھٹنوں اور دونوں پاؤں کے کناروں پر۔۔۔''

(صحیح البخاری : ۸۱۲، صحیح مسلم : ۴۹۰)

② سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: **فصلّى بنا النبيّ صلّى اللّه عليه وسلّم حتّى رأيت أثر الطّين والماء على جبهه رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلّم وأرنبته .**

''نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی، حتی کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک اور ناک کے کنارے پر مٹی اور پانی کا نشان دیکھا۔'' (صحیح البخاری : ۸۱۳، صحیح مسلم : ۱۱۶۷)

③ سیدنا ابوحمید الساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

انّ النّبيّ صلّى اللّه عليه وسلّم كان إذا سجد أمكن أنفه وجبهته من الأرض .

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ فرماتے تو اپنے ناک اور پیشانی مبارک کو زمین پر ٹیکتے تھے۔''

(سنن الترمذی : ۲۷۰، وقال : حسن صحیح ، وسندہٗ حسنٌ)

④ سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا صلاة لمن لم يضع أنفه على الأرض . ''اس شخص کی کوئی نماز نہیں، جس نے اپنے ناک کو زمین پر نہیں رکھا۔'' (سنن الدارقطنی : ۳۴۸/۱، ح : ۱۳۰۳، وسندہٗ حسنٌ)

ان احادیثِ مبارکہ کی آلِ تقلید نے تین طرح سے مخالفت کی ہے:

① فقہ حنفی کی معتبر ترین کتابوں میں لکھا ہے: **ولو ترك وضع اليدين والرّكبتين جازت صلاته بالإجماع ، كذا في السّراج والوهّاج .**

''اور اگر (نمازی) دونوں ہاتھ اور دونوں گھٹنے زمین پر نہ رکھے تو اس کی نماز بالاجماع جائز ہے، السراج والوہاج میں اسی طرح ہے۔'' (فتاوی عالمگیری : ۷۰/۱، العنایة فی شرح الهداية : ۴۹۶/۱)

صاحبِ ہدایہ نماز جیسے رکنِ اسلام کا یوں مذاق اُڑاتے ہیں:

ووضع اليدين والرّكبتين سنّة عندنا لتحقّق السّجود بدونهما .

''ہاتھوں اور گھٹنوں کو رکھنا ہمارے نزدیک سنت ہے، کیونکہ ان کے بغیر سجدہ ہو جاتا ہے۔''

(الهداية : ۴۷/۱)

قارئین کرام! دیکھے ہیں آپ نے ''فقیہانِ حرم'' کے کرشمے! کس طرح حدیثِ نبوی کے خلاف اجماع واتفاق کر لیتے ہیں۔ بھلا نماز کے ساتھ اس قسم کا سنگین مذاق واستہزاء کسی اور نے کیا ہے؟ دراصل یہ لوگ اعمال کو ایمان نہیں سمجھتے، اس لیے اس قسم کی کاروائی سے اعمالِ دین کو بے وقعت کرنا چاہتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو قرآن وحدیث کے ساتھ اس طرح کا غیر محتاط رویہ اختیار کرنے سے بچائے۔ آمین!

②، ③ ابنِ نجیم حنفی لکھتے ہیں: **الاقتصار علی الأنف، فعنده یجوز مطلقا، وعندهما لا یجوز إلّا لمن عذر بالجبهة، کما صرّح به صاحب الهدایة.**

''صرف ناک پر سجدہ کرنا امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہر حالت میں جائز ہے، جبکہ امام ابویوسف ومحمد کے نزدیک پیشانی میں کسی تکلیف کی وجہ سے صرف ناک پر سجدہ کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ صاحبِ ہدایہ نے اس کی صراحت کی ہے۔'' (البحر الرائق لابن نجیم الحنفی : ۳۵۸/۲)

صاحبِ ہدایہ لکھتے ہیں: **فإن اقتصر علی أحدهما جاز عند أبی حنیفة رحمه الله، وقالا: لا یجوز الاقتصار علی الأنف إلّا من عذر.**

''اگر (نمازی) ان دونوں اعضاء (پیشانی اور ناک) میں سے کسی ایک پر اکتفا کر لے تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے، جبکہ ابویوسف ومحمد بن حسن کا کہنا ہے کہ کسی عذر کی بنا پر ہی صرف ناک پر سجدہ کیا جا سکتا ہے۔'' (الهدایة : ۴۷/۱)

امام ابن المنذر رحمہ اللہ اس قول کے ردّ میں لکھتے ہیں: **هذا قول النّعمان، وهو قول لا أحسب أحدا سبقه إلیه، ولا تبعه علیه.**

''یہ نعمان (بن ثابت ابوحنیفہ) کا قول ہے، میں نہیں جانتا کہ کسی نے ان سے پہلے ایسی بات کہی ہو، نہ ہی بعد میں کسی نے اس بات میں ان کی موافقت کی ہے۔'' (الاوسط لابن المنذر : ۱۷۷/۳)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ، امام ابن المنذر رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

إجماع الصّحابة علی أنّه لا یجزئ السّجود علی الأنف وحده.

''اس بات پر صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ اکیلے ناک پر سجدہ کرنا کفایت نہیں کرتا۔''

(فتح الباری لابن حجر : ۲۹۶/۲)

علامہ ابنِ قدامہ رحمہ اللہ (م۶۲۰ھ) لکھتے ہیں: **فی قول أبی حنیفة أنّه یجزئ أن یسجد علی أنفه دون جبهته ، وھذا قول یخالف الحدیث الصّحیح والإجماع .**

''امام ابوحنیفہ کے قول میں پیشانی کے بغیر صرف ناک پر سجدہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ قول صحیح حدیث اور اجماع کے مخالف ہے۔'' (المغنی لابن قدامة : ۱۹۷/۲)

لہٰذا یہ کہنا کہ صرف ناک پر سجدہ جائز ہے، یہ صحیح احادیث اور اجماعِ امت کی خلاف ورزی ہے۔ سجدہ جو نماز کا بنیادی رکن ہے، اس کا حلیہ بگاڑنے والی بات ہے۔

الحاصل : سجدہ سات اعضاء پر کرنا واجب ہے، صرف پیشانی یا صرف ناک پر سجدہ کرنا دینِ اسلام سے مذاق اور ناجائز کام ہے۔

✱✱✱✱✱✱✱

حدیث کو قرآن پر پیش کرنا رافضیوں کا طریقہ ہے۔

ابنِ شہاب دین

ایک مشہور غالی ورافضی شیعہ لکھتا ہے: **وقد دلّت الأخبار المتواترة علی وجوب عرض الرّوایات علی الکتاب والسّنّة ، وأنّ ما خالف الکتاب منها یجب طرحه وضربه علی الجدار .** ''متواتر احادیث اس بات پر دلیل ہیں کہ روایات کو کتاب وسنت پر پیش کرنا واجب ہے، ان میں سے جو قرآن کے خلاف ہو، اسے چھوڑنا اور دیوار پر دے مارنا واجب ہے۔''

(الاصول من الکافی : ۱۵۳/۱)

وہ متواتر احادیث کسی رافضی کی پٹاری میں ہوں گی۔ محدثین کرام نے بالاتفاق اس موضوع کی تمام روایات کو ''موضوع ومن گھڑت'' اور ''ضعیف'' کہا ہے۔ ائمہ دین کا اتفاقی فیصلہ ہے کہ کوئی صحیح حدیث قرآنِ کریم کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ دعویٰ ایسے دعویداروں کی اپنی کم فہمی ہے۔

یہ تو ایک رافضی کی بات تھی، لیکن صد افسوس ہے کہ اپنے آپ کو اہل سنت میں سے شمار کرنے والے بہت سے ''علماء'' اور عوام اسی کی رٹ لگاتے سنائی دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ فرمائے!

اعتراض نمبر ⑥ : ''(٤) یہ صلح نامہ چار دفعات پر مشتمل تھا، جیسا کہ میں نے بین القوسین لکھ دیا ہے۔ عبید اللہ نے ان میں سے بس کچھ تیسری اور چوتھی دفعہ کا ذکر کیا ہے، وہ بھی غلط، کیونکہ چوتھی دفعہ یہ تھی کہ مکہ والوں میں سے کوئی شخص مدینہ چلا جائے تو اسے آپ اپنے پاس نہ رہنے دیں گے اور مسلمانوں میں سے کوئی شخص اسلام چھوڑ کر مکہ آجائے تو اسے ہم سے طلب نہ کریں گے۔ عبید اللہ نے اسے ٹھیک بیان نہیں کیا۔'' (''صحیح بخاری کا مطالعہ'' : ٧٤/١)

جواب : ① قارئین کرام! کلام میں اجمال و تفصیل کا ہونا ایک مسلّم امر ہے، یعنی بعض دفعہ ایک شخص ایک واقعہ کو اجمالاً اختصار سے بیان کرتا ہے اور دوسری دفعہ اس کو تفصیل سے کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ اگر سب شروط کا ذکر عبید اللہ بن موسیٰ نے نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شروط انہوں نے حذف کی ہیں، بلکہ انہوں نے اپنے استاذ سے سنی ہی اسی طرح تھیں۔

جو دفعات اس معاہدے میں ثابت ہیں، وہ دوسری صحیح احادیث میں موجود ہیں، لہٰذا یہ تفصیل دوسری حدیثوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس حوالے سے ہم ایک مثال پیش کر کے بات سمجھاتے ہیں :

سورۂ اعراف (١١۔١٢) وغیرہ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا۔ ابلیس کے سوائے سب نے سجدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے سجدہ نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا، مجھے تُو نے آگ سے پیدا کیا اور اُسے مٹی سے، لہٰذا میں اسے سجدہ نہیں کر سکتا۔۔۔ جبکہ سورۂ بقرہ (٣٤) وغیرہ میں شیطان کے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کا ذکر تو ہے، لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے اس بارے میں پوچھ گچھ بھی کی تھی۔

کیا کسی منکرِ قرآن کا سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت پر یہ اعتراض کرنا صحیح ہوگا کہ وہ (معاذ اللہ) ناقص ہے؟ اگر وہاں یہ اعتراض کرنا بے عقلی کی دلیل ہے اور اس سے کفر لازم آجاتا ہے تو حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو وحی ہے، اس پر اس طرح کے بے تکے اعتراضات کرنا ایک مسلمان کو کیسے روا ہے؟

② رہی بات غلط بیان کرنے کی تو گزشتہ اعتراضات کے جواب میں ہم نے بڑی تفصیل

سے واضح کر دیا ہے کہ وہ دراصل میرٹھی صاحب کی کم علمی پر مبنی اپنی غلطیاں ہیں، جنہیں وہ ''چور بھی کہے چور چور'' کا مصداق بن کر عبیداللہ بن موسیٰ کے ذمہ تھوپنا چاہتے ہیں۔ تفصیل کے لیے اعتراض نمبر ④ کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

اعتراض نمبر ⑦ : ''(٥) عبیداللہ کی روایت میں ہے: **فلمّا دخلها ومضى الأجل .** سیاقِ روایت سے اس کا مطلب یہ نکل رہا ہے کہ حدیبیہ کے سال ہی سن ٦ ہجری میں آپ صلح نامہ کے مطابق مکہ میں داخل ہوئے، حالانکہ یہ غلط ہے۔ اس سال تو آپ صلح نامہ کے مطابق حدیبیہ سے ہی مدینہ واپس ہو گئے تھے۔ سن ٧ ہجری میں عمرۃ القضاء کے لیے مع اصحاب مکہ تشریف لے گئے ہیں۔۔۔'' ("صحیح بخاری کا مطالعہ" : ٧٤/١)

جواب : میرٹھی صاحب نے ''تحقیق وتنقید'' کے نام سے خام مال اپنی کتاب میں لوڈ کیا ہے۔ بالکل یہی اعتراض پہلے بھی میرٹھی صاحب نے کیا تھا، جسے ہم اعتراض نمبر ③ کے تحت ذکر کر چکے ہیں، لیکن اگلے ہی صفحہ پھر وہی اعتراض دہرایا ہے۔

قارئین خود فیصلہ کریں کہ کیا تحقیق وتنقید اسی روش کا نام ہے؟ نامعلوم میرٹھی صاحب کا حافظہ ہی کام چھوڑ گیا تھا یا پھر انہوں نے محض کتاب کا حجم بڑھانے کے لیے ایسی کاروائی کی ہے؟

تحقیق و تنقید یا بازی گری ؟

قارئین کرام یہ دیکھتے آرہے ہیں کہ میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کی اس متفقہ طور پر صحیح حدیث پر مذکورہ سارے اعتراضات صرف عبیداللہ بن موسیٰ رحمہ اللہ کو آڑ بنا کر کیے ہیں۔ ان کو رافضی، بدعقیدہ، غالی شیعہ، عیار، دھوکہ باز، غلوکار، کج رَو اور نامعلوم کیا کیا کہا ہے۔ لیکن گرگٹ کی طرح ان کا رنگ بدلنا دیکھیں کہ اس پر ایڑی چوٹی کا پورا زور صرف کر کے اب خود ہی اقرار کر لیا ہے کہ:

''لیکن ان غلط بیانیوں کا ذمہ دار عبیداللہ بن موسیٰ نہیں، کیونکہ حجین بن مثنی (مسند : ٢٩٨/٤) اور محمد بن یوسف فریابی نے بھی اسرائیل سے اس طرح کی روایت کی ہے۔ (سنن دارمی ، کتاب السیر) ، پس یہ غلط بیانیاں اسرائیل بن یونس کی ہیں۔'' ("صحیح بخاری کا مطالعہ" : ٧٤/١)

معلوم ہوا کہ قصور نہ بے چارے عبیداللہ بن موسیٰ کا ہے نہ ہی اسرائیل بن یونس کا ، بلکہ ان منکرینِ حدیث کی اپنی عقل کا ہے، جو حدیث اور اجماعِ امت کو تسلیم کرنے کی بجائے اس طرح کی بے

وقوفیاں ہانکتی رہتی ہے۔اب میرٹھی صاحب کے معتقدین کو چاہیے کہ وہ تمام القابات جو اس حدیث پر اعتراض کرنے کے لیے انہوں نے عبیداللہ بن موسیٰ کو دیئے تھے، خود ہی اپنے پیشوا کے ساتھ فٹ کرلیں، کیونکہ خود انہوں نے اعتراف کرلیا ہے کہ یہ غلطیاں عبیداللہ بن موسیٰ کی نہیں، لہٰذا ان کی ساری کوشش بالکل رائیگاں اور فضول رہی ہے۔

انصاف پسند لوگ خود ہی سوچیں کہ یہ تحقیق وتنقید ہے یا بازی گری؟

ع دھوکہ دیتے ہیں یہ بازی گر کھلا !

اعتراض نمبر ⑧ :

”دوسرا قصہ دختر حمزہ کا ہے کہ مکہ سے روانگی کے وقت وہ **یا عمّ ، یا عمّ** پکارتی ہوئی آپ کے پیچھے ہولی اور علی نے اسے حضرت فاطمہ کے حوالے کردیا، پھر مدینہ پہنچنے پر اس کی کفالت کے تین دعوے دار ہوئے۔علی اور ان کے بڑے بھائی جعفر اور زید بن حارثہ۔آپ نے اس کا فیصلہ حضرت جعفر کے حق میں فرمایا، کیونکہ ان کی بیوی اسماء بنت عمیس اس لڑکی کی خالہ تھیں اور آپ نے تینوں حضرات کے متعلق ایک ایک بات کہی، جسے سن کر ان پر وجد طاری ہوگیا اور فرطِ مسرت سے رقص کرنے لگے۔علی سے آپ نے **أنت منّي وأنا منك** ، زید سے **أنت أخونا ومولانا** ، جعفر سے **أشبهت بي خلقا وخلقا** فرمایا تھا۔

یہ قصہ ابواسحاق نے ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی سے سنا تھا، جو قطعاً گھڑا ہوا اور شروع سے آخر تک محض جھوٹ ہے۔اسماء بنت عمیس اور سلمیٰ بنت عمیس دونوں بہنیں قدیمۃ الاسلام صحابیہ ہیں۔

اسماء کی شادی حضرت جعفر بن ابی طالب سے ہوئی تھی اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اپنے شوہر حضرت جعفر کے ساتھ حبشہ ہجرت کرکے گئیں، پھر سن ۷ ہجری میں ان ہی کے ساتھ حبشہ سے مدینہ آئیں اور حضرت سلمیٰ رضی اللہ عنہا اپنے شوہر حضرت حمزہ کے ساتھ مدینہ ہجرت فرما گئیں۔حضرت حمزہ کی بیٹی، جس کا اس روایت میں ذکر ہے، یقیناً سلمیٰ بنت عمیس کے بطن سے تھی۔اس لڑکی کے والدین، یعنی حضرت حمزہ وسلمیٰ نے جب مکہ سے ہجرت کی ہے تو کیا وہ اپنی کمسن بیٹی کو مکہ میں چھوڑ سکتے تھے؟ حضرت حمزہ غزوۂ احد میں شہید ہوگئے، ان کے بعد حضرت شداد بن الہاد لیثی رضی اللہ عنہ سے سلمیٰ کا نکاح ہوگیا۔عبداللہ بن شداد بن الہاد مشہور تابعی سلمیٰ کے بطن سے ہی پیدا ہوئے تھے اور شداد بن الہاد مہاجر صحابی ہیں۔بقولِ ابن سعد غزوۂ خندق اور بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے تھے۔

الغرض حضرت حمزہ کی یہ بیٹی جس کا اکثر محدثین نے عمارہ نام بنایا ہے، حضرت حمزہ کے بعد باپ کے سایہ سے محروم ہوگئی تھی، لیکن اس کی ماں سلمٰی بنتِ عمیس تو موجود تھی ۔ ماں کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے متعلق ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی سے جو قصہ مروی ہے، جس کی ان دونوں نے بقول ابواسحاق سبیعی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اس کے برخلاف خود حضرت علی سے نافع بن عجیر نے روایت کی ہے۔۔۔

سنداً یہ حدیث مضطرب ہے اور اس کا راوی نافع بن عجیر مجہول الحال ہے۔ اس پر بھی وہی اشکال وارد ہوتا ہے کہ دختر حمزہ کا مکہ میں رہ جانا غیر معقول ہے اور بالفرض وہ رہ ہی گئی تھی اور عمرۃ القضاء کے بعد زید بن حارثہ اسے جا کر لائے تھے تو مدینہ میں اس کی والدہ سلمٰی بنتِ عمیس تو موجود تھیں۔ ان کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت بے معنیٰ بات تھی۔

بہر کیف حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا یہ قصہ نری غپ شپ ہے اور عبیداللہ بن موسیٰ نے تو اسے حضرت براء بن عازب کی طرف منسوب کر کے کڑوا کریلا پھر نیم چڑھا بنا دیا اور دروغ گوئی کو دو آتشہ کر دیا تھا۔'' (''صحیح بخاری کا مطالعہ'': ۱/۷۴-۷۷)

جواب : ① میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کی صحت پر امتِ مسلمہ کے اتفاق کو لات مارنے کے لیے جو بہانہ بنایا ہے، وہ بالکل بودا ہے۔ ان کے اعتراض کا حاصل دو باتیں ہیں، اوّل یہ کہ ہجرت کے وقت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی سلمٰی بنت عمیس نے اپنی بیٹی کو مکہ میں کیسے چھوڑ دیا تھا اور ثانی یہ کہ ماں کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت کا سوال کیسے پیدا ہوتا ہے؟

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وهذا يشعر بأنّ أمّها إمّا لم تكن أسلمت ... وإمّا أن تكون ماتت ...** ''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس (دختر حمزہ) کی ماں یا تو (اس وقت تک) مسلمان نہیں ہوئی تھی یا پھر وہ فوت ہو چکی تھی۔'' (فتح الباری لابن حجر: ۷/۵۰۶)

اس سے میرٹھی صاحب کے دونوں اعتراض رفع ہو گئے ہیں۔ پہلے حمزہ رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے وقت اپنی بیٹی کو مکہ میں اس لیے چھوڑا تھا کہ اس کی ماں ابھی مسلمان نہیں ہوئی تھی اور بچی ابھی چھوٹی تھی۔

پھر ماں کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت کا بھی سوال اسی لیے پیدا ہوا کہ ماں اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئی تھی، اب لڑکی باشعور ہو رہی تھی، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے اس بات کو

مناسب نہیں سمجھا کہ وہ اپنی مشرک ماں کے ساتھ رہے۔ یا ماں مسلمان ہو کر فوت ہو چکی تھی ،لہٰذا خالہ کو کفالت سونپنا پڑی۔

اب میرٹھی صاحب کے معتقدین کو چاہیے کہ وہ اس صحیح حدیث پر میرٹھی صاحب کے ان دو اعتراضات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے قدیمۃ الاسلام ہونا تو دُور کی بات ہے، ہجرتِ مدینہ کے وقت تک بھی سلمٰی بنتِ عمیس کا مسلمان ہونا ثابت کر دیں اور پھر فتحِ مکہ کے وقت ان کا مسلمان ہو چکنا اور زندہ رہنا کسی مستند ذریعہ سے دکھا دیں۔ ورنہ جان لیں کہ یہ سب بہانے ہیں، حقیقت نہیں۔

② ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی دونوں ثقہ راوی ہیں ۔ ان پر تفصیلی بحث ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں، پھر وہ دونوں صحیح بخاری کی سند میں موجود بھی نہیں ہیں، لہٰذا اپنی مرضی سے ان کو یہاں ٹھونس کر اور ان پر جرح کر کے اس قصہ کو گھڑا ہوا اور جھوٹ قرار دینا بجائے خود کائنات کا بدترین جھوٹ ہے اور منکرینِ حدیث کی جہالت و لاعلمی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

③ نافع بن عجیر کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اس قصہ کو روایت کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ ابو اسحاق کا سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے اسے بیان کرنا غلط ہے، بلکہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ قصہ مروی ہے اور سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی۔

رہا نافع بن عجیر کو مجہول الحال کہنا تو یہ اور بڑی جہالت ہے، کیونکہ بہت سے محدثین مثلاً ابو القاسم بغوی، ابو نعیم، ابنِ حبان وغیرہ نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے۔(تہذیب التہذیب لابن حجر : ۱۰/۴۰۸) صحابہ کرام سب کے سب عادل وضابط ہیں، صحتِ سند کے لیے ان کے حالات معلوم کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

بالفرض ان کو صحابی تسلیم نہ کیا جائے تو بھی وہ ثقہ ہیں، کیونکہ امام ابنِ حبان رحمہ اللہ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور امام حاکم رحمہ اللہ (المستدرک :۳/۲۱۱) ان کی حدیث کے بارے میں ''صحیح علی شرط مسلم'' فرما گئے ہیں، جو کہ ان کی توثیق ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی وُثِّقَ کہہ کر ان کی توثیق کی طرف اشارہ کیا ہے۔(الکاشف : ۵۷۸۴)

معلوم ہوا کہ میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض بھی محض جہالت پر مبنی ہے۔

④ نافع بن عجیر کی حدیث کو سنداً ''مضطرب'' کہنا بھی بہت بڑی بے وقوفی ہے، کیونکہ

میرٹھی صاحب کے نزدیک نافع بن عجیر ''مجہول الحال'' ہیں، لہٰذا ان کی روایت ہی ''ضعیف'' ہے، جبکہ اضطراب ہمیشہ ایسی سندوں میں ہوسکتا ہے جو صحت میں برابر ہوں، ایک ''صحیح'' اور ایک ''ضعیف'' سند کسی صورت بھی ایک دوسرے کے مقابلے میں ''مضطرب'' نہیں کہلا سکتیں۔

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ اصولِ حدیث کے بارے میں اپنی مشہورِ زمانہ کتاب میں لکھتے ہیں:

المضطرب من الحديث : هو الّذی تختلف الرّواية فيه ، فيرويه بعضهم علی وجه وبعضهم علی وجه آخر مخالف له ، وإنّما نسمّيه مضطربا إذا تساوت الرّوايتان ، أمّا إذا ترجّحت إحداهما بحيث لا تقاومها الأخری بأن راويها أحفظ أو أكثر صحبة للمرویّ عنه أو غير ذلک من وجوه التّرجيحات المعتمدة فالحكم للرّاجحة ، ولا يطلق عليه حينئذ وصف المضطرب ولا له حكمه .

''مضطرب حدیث وہ ہوتی ہے، جس کی روایت مختلف ہو جائے، بعض راوی ایک طرح بیان کریں اور بعض اس کے خلاف کسی اور طرح بیان کریں۔ ہم حدیث کو مضطرب صرف اسی وقت کہتے ہیں، جب دونوں (مختلف روایات قوت میں) برابر ہوں۔ لیکن جب ایک روایت دوسری روایت پر ترجیح پا جائے اور دوسری اس کا مقابلہ نہ کر سکے، اس طرح کہ ایک کا راوی زیادہ حافظہ والا اور اپنے استاذ سے زیادہ صحبت رکھنے والا ہو یا قابلِ اعتماد وجوہِ ترجیح میں سے کوئی موجود ہو تو حکم راجح روایت کا ہی ہوگا۔ اس وقت ہم اس حدیث پر مضطرب کے وصف کا اطلاق نہیں کریں گے، نہ ہی اس کا حکم مضطرب والا ہوگا۔'' (مقدمة ابن الصلاح : ص ٥٥)

قارئین کرام! جب دو ایسے ثقہ راویوں کی ایک دوسرے کے مخالف روایت بھی ''مضطرب'' نہیں ہوسکتی، جن میں سے ایک حافظے میں دوسرے سے بڑھ کر ہو تو اس راوی کی روایت ثقہ راویوں کی روایت کے مقابلے میں آ کر ''مضطرب'' کیسے ہوسکتی ہے، جس کو خود میرٹھی صاحب ''مجہول الحال'' قرار دے رہے ہیں؟

یہ ہے میرٹھی صاحب کا مبلغِ علم اور وہ اعتراضات کرتے ہیں امتِ مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر! بلاشبہ انکارِ حدیث کا بڑا سبب اصولِ حدیث سے لاعلمی ہے۔ کسی دانشور نے سچ کہا ہے:

إنّما النّاس أعداء لما يجهلون . ''لوگ جس چیز کو نہ جان سکیں، یقیناً اس کے

مخالف ہو جاتے ہیں۔''

''میں نہ مانوں'' کا علاج تو کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔منصف مزاج آدمی کے سامنے سارے حقائق رکھ دیئے گئے ہیں۔ ہر ذی شعور سمجھ سکتا ہے کہ میرٹھی صاحب کا کبھی عبیداللہ بن موسیٰ کو ''دروغ گو'' وغیرہ کہہ کر مطعون کرنا اور کبھی تھوک چاٹ کر فوراً ساری ''غلط بیانیوں'' کا ذمہ دار اسرائیل بن یونس کو بنانا محض ہٹ دھرمی پر مبنی ہے، تحقیق وتنقید قطعاً نہیں۔

قارئین کرام سے ہماری اپیل ہے وہ دلائل کو پرکھیں، حقائق کو دیکھیں اور حق کے پیرو بنیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں حق سمجھنے اور اس پر ڈٹ جانے کی توفیق عطا فرمائے! آمین!

قارئین کرام! صحیح بخاری (۹۳۶، ۲۰۵۸، ۲۰۶۴، ۴۸۹۹) وصحیح مسلم (۸۶۳) وغیرہ کی مذکورہ بالا صحیح حدیث آپ نے بارہا سنی ہوگی اور امتِ مسلمہ بالاتفاق اسے صحیح ہی سمجھتی آئی ہے۔صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر آج تک کے تمام مسلمان اس صحیح حدیث کے مطابق سورۂ جمعہ کی آیت (۶۲/۱۱) کی تفسیر یہی کرتے رہے ہیں کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ جمعہ کا خطبہ ارشاد کر رہے تھے کہ ایک تجارتی قافلہ مدینہ میں داخل ہوا۔شروع میں جس طرح نماز میں ایک دوسرے کے ساتھ کلام کی گنجائش تھی، بعد میں کلام کی ممانعت ہوئی، اسی طرح خطبہ میں بھی اتنی سخت پابندیاں عائد نہیں کی گئی تھیں، لہٰذا سامعین میں سے بارہ آدمیوں کے علاوہ باقی تمام لوگ اس قافلے کی طرف چلے گئے، خطبہ کی کوئی پرواہ نہ کی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور مسلمانوں کو سمجھا دیا کہ جمعہ کا خطبہ تمہارے لیے تجارت اور وغیرہ سے بہتر ہے۔رہا تمہارا یہ اندیشہ کہ جمعہ پڑھتے پڑھتے ہم سامانِ خوردونوش سے محروم ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ سب سے بڑا رزّاق ہے، وہ تمہیں ضرور سب کچھ مہیا کر دے گا، لہٰذا آئندہ ایسا کرنا تمہارے لیے قابل مؤاخذہ جرم ہوگا۔

لیکن چودہ سو سال سے ساری امتِ مسلمہ کی اس متفقہ تفسیر اور پھر صحیح بخاری ومسلم کی صحت

پر پوری امت کے اجماع واتفاق کے خلاف پندرہویں صدی میں پیدا ہونے والے شبیر احمد از ہر میرٹھی صاحب اس پر جاہلانہ، بے وقوفانہ اور ہٹ دھرمانا اعتراضات کر کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر آج تک کے تمام محدثین ومفسرین کو جاہل واعظ اور گپیں ہانکنے والے راوی قرار دے کر اس کا انکار کر دیا ہے، ان کی بکواسات پیشِ خدمت ہیں:

''ان وجوہ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث باطل ہے اور اس میں جو قصہ مذکور ہے قطعاً بے اصل ہے۔ جاہل واعظوں اور اناپ شناپ بکنے والے راویوں نے قرآنِ کریم کی ہر آیت کا الگ الگ شانِ نزول بیان کرنے کی جو بے ہودہ بدعت تابعین واتباعِ تابعین کے دور میں پھیلا دی تھی، وہی اس قصہ کے گھڑنے کا باعث ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے۔'' ("صحيح بخاری کا مطالعه" : ۸۲/۱)

آیئے ان وجوہ کا جائزہ لیں، جن کہ بنا پر میرٹھی صاحب نے اس حدیث کو باطل اور بے ہودہ قرار دیا ہے، تاکہ قارئین کو میرٹھی صاحب کی جہالت وحماقت کا یقین بھی ہو جائے اور اس بات کا کچھ اندازہ بھی ہو جائے کہ صحیح بخاری وصحیح مسلم کی صحت پر امتِ مسلمہ کا اتفاق قطعی طور پر نا قابل تسخیر ہے۔

لیکن پہلے ہم میرٹھی صاحب کی اس بات کا جواب دینا چاہیں گے کہ ان کے بقول تابعین اور تبع تابعین کے دور میں جو ''بدعت'' شروع ہوئی تھی، وہ اس حدیث کے گھڑے جانے کا سبب بنی، حالانکہ یہی اس آیتِ مبارکہ کا یہی شانِ نزول صحابہ کرام میں بھی معروف تھا، چنانچہ صحیح مسلم میں موجود ہے:

عن أبی عبيدة عن كعب بن عجرة : قال دخل المسجد وعبد الرّحمن بن أمّ الحكم يخطب قاعدا ، فقال : انظروا إلى هذا الخبيث ، يخطب قاعدا ، وقال الله تعالىٰ : ﴿ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ﴾

''ابوعبیدہ (بن عبداللہ بن مسعود) بیان کرتے ہیں کہ صحابیٔ رسول سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے، عبدالرحمٰن بن ام الحکم بیٹھ کر خطبہ دے رہا تھا۔ آپ نے فرمایا، اس خبیث کی طرف دیکھو کہ یہ بیٹھ کر خطبہ دے رہا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ﴾ (اے نبی! جب وہ تجارت یا کھیل دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں)۔'' (صحيح مسلم : ۸٦٤)

یہ ہے میرٹھی صاحب کے مطالعہ کی وسعت کا عالم! ان کو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اس آیتِ

مبارکہ کی یہ تفسیر تابعین اور تبع تابعین کے دور میں شروع نہیں ہوئی ، بلکہ یہی تفسیر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی کرتے رہے ہیں۔ایسے کم علم شخص کو اس طرح کے خالص علمی کاموں میں پڑنے کی بھلا کیا ضرورت تھی ، جو بجائے اس کی عزت افزائی کے قیامت تک ذلت افزائی کا سبب بن گئے ہیں؟ تابعین و تبع تابعین اور محدثین پر طعن و تشنیع کرنے والے شخص کو اپنا علمی معیار بہت اچھا نہیں تو کم از کم گزارے کے قابل ضرور بنالینا چاہیے تھا!

''روایتی'' اعتراضات

میرٹھی صاحب نے اس حدیث پر روایت کے لحاظ سے جو اعتراضات کیے ہیں، وہ درحقیقت ان کے روایتی اعتراضات ہیں، علمی نہیں۔ان کی علمی حیثیت ملاحظہ فرمائیں:

اعتراض نمبر ① : ''پس حصین بن عبدالرحمٰن سے یہ حدیث (۱)زائدہ (۲) خالد بن عبداللہ الطحان (۳) جریر بن عبدالحمید (٤) ہشیم بن بشیر اور (٥) عبداللہ بن ادریس نے روایت کی ہے۔ان پانچوں کی روایت میں متن و اسناد کے لحاظ سے اختلاف ہے۔متن کا اختلاف یہ ہے کہ زائدہ کی روایت کے مطابق تجارتی قافلہ کی آمد پر بارہ شخصوں کے علاوہ تمام صحابہ کرام نماز پڑھنے کی حالت میں آپ کو چھوڑ کر نماز توڑ کر نکل گئے تھے اور خالد و جریر و عبداللہ بن ادریس کی روایت کے مطابق خطبہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔اس وقت آپ خطبہ دے رہے تھے۔اسی پر ہشیم کی روایت محمول ہے،اس میں صراحتاً نہ خطبہ کا ذکر ہے نہ نماز کا،بس یہ ہے کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے تھے۔

اصولاً چار ثقہ راویوں کی روایت ایک ثقہ کی روایت پر راجح ہے اور باور کرنا چاہیے کہ زائدہ کو وہم ہوگیا تھا کہ خطبہ کی بجائے نماز کا ذکر کردیا۔'' (''صحیح بخاری کا مطالعہ'' : ۷۹/۱۔۸۰)

جواب : ① قارئین کرام! یہ تھی پہلی وجہ جس کی بنا پر میرٹھی صاحب نے اس بالاتفاق صحیح حدیث کا انکار کیا ہے،لیکن اس اعتراض کا باعث میرٹھی صاحب کی علمی تنگدستی ہے۔

اپنے بڑے ثقہ راوی یا زیادہ ثقہ راویوں کے خلاف کسی ثقہ راوی کی روایت کو ''شاذ'' کہتے ہیں۔اس کی تعریف محدثین کی زبانی سن لیں اور پھر دیکھیں کہ زائدہ کی روایت کو ''شاذ'' کہنا اصولِ حدیث کی موافقت ہے یا مخالفت! حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ ، امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کرتے

ہوئے لکھتے ہیں: لیس من الشّاذّ أن یروی الثّقة ما لا یروی غیرہ ، انّما الشّاذّ أن یروی الثّقة حدیثا یخالف ما روی النّاس . ''شاذ یہ نہیں کہ ثقہ راوی وہ (حدیث یا الفاظ) بیان کرے جو دوسرے بیان نہیں کرتے ، بلکہ شاذ تو صرف یہ ہے کہ ثقہ راوی ایسی حدیث بیان کرے جو دوسرے (ثقہ) لوگوں کی روایت کردہ کے مخالف ہو۔''

معلوم ہوا کہ اگر ایک ثقہ راوی اور زیادہ ثقہ رایوں کی بیان کردہ بات میں اختلاف ہو تو ایک ثقہ راوی کی بات ''شاذ'' اور غیر مقبول ہوگی ،لیکن اگر سب کی بات ایک ہی ہو،اس میں کوئی حقیقی اختلاف نہ ہو، بلکہ صرف ایک آدمی کو اپنی کم علمی و کم فہمی کی وجہ سے اس میں اختلاف نظر آتا ہو تو اسے باطل کہنا خود باطل ہوگا۔تمہید کے طور پر اتنی بات ذہن نشین کر لینے کے بعد ہم قارئین کو بتانا چاہتے ہیں کہ زائدہ کی روایت اور ان کے علاوہ چار راویوں کی روایت ایک ہی ہے،اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

وہ اس طرح کہ زائدہ نے خطبہ کی جگہ نماز کا لفظ بولا ہے اور یہ اختلاف نہیں ، بلکہ اتفاق ہے ، کیونکہ: (ا) خطبہ نمازِ جمعہ کا ہی حصہ ہے،نمازِ ظہر کی دو رکعت کم کر کے ان کی جگہ خطبہ رکھا گیا ہے،گویا خطبہ انہی دو رکعتوں کا بدل ہے، جو جمعہ کے دن نمازِ ظہر سے ختم کی گئی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ نماز کی طرح خطبۂ جمعہ میں بھی آپس کی کلام اور دیگر مصروفیات مثلاً خرید و فروخت وغیرہ سے سختی کے ساتھ روک دیا گیا ہے۔ یہ حدیث بھی اسی بات کی تعلیم دیتی تھی ، جسے میرٹھی صاحب نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے ردّ کیا ہے۔

(ب) رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نماز کے انتظار کو نماز ہی شمار کرتے تھے۔

❁ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عشاء کی نماز کے لیے تقریباً آدھی رات تک رسول اللہ ﷺ کا انتظار کیا، پھر آپ ﷺ تشریف لائے، خطبہ ارشاد کیا اور فرمایا: ((ألا إنّ النّاس قد صلّوا ، ثمّ رقدوا ، وإنّکم لم تزالوا فی صلاة ما انتظرتم الصّلاة)) ''خبردار! یقیناً (مدینہ سے باہر رہنے والے مسلمان) لوگ نماز پڑھ چکے، پھر سو بھی چکے ہیں، بلاشبہ تم جب تک نماز کا انتظار کرتے رہے ہو، نماز میں ہی رہے ہو۔''

(صحیح بخاری : ٦٠٠، صحیح مسلم : ٦٤٠)

❁ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لا يزال العبد فی صلاة ما كان فی المسجد ينتظر الصّلاة ما لم يحدث))

''بندہ جب تک باوضو ہوکر مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے، نماز میں ہی ہوتا ہے۔''

(صحیح بخاری : ۱۷٦، صحیح مسلم : ٦٤٩)

❁ سیدنا سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من كان فی المسجد ينتظر الصّلاة ، فهو فی الصّلاة))

''جو نماز کے انتظار میں مسجد کے اندر ہو، وہ نماز میں ہی ہوتا ہے۔''

(مسند الامام احمد : ٥/٣٣١، سنن النسائی : ٧٣٤، وسندہٗ حسنٌ)

اس حدیث کو امام ابنِ حبان رحمہ اللہ (۱۷۵۲) نے ''صحیح'' قرار دیا ہے۔ کتبِ حدیث میں اس کے کئی اور شواہد بھی موجود ہیں۔

❁ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی نماز کے انتظار کو نماز ہی شمار کرتے تھے، جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے نمازِ جمعہ کے دن قبولیت والے وقت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ وقت عصر سے مغرب کے درمیان ہوتا ہے، آگے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی زبانی سنیے:

فقلت : إنّ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال : فی صلاة ، وليست بساعة صلاة ، ، قال : أو لم تعلم أنّ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم قال : ((منتظر الصّلاة فی صلاة)) ، قلت : بلى هی ، والله ! هی .

''میں نے (عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے) کہا، بلاشبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ (یہ وقت) نماز میں ہوتا ہے اور یہ (عصر سے مغرب تک کا وقت) تو نماز کا وقت نہیں ہے، انہوں نے فرمایا، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ نماز کا انتظار کرنے والا نماز میں ہی ہوتا ہے؟ میں نے کہا، ہاں! یہ وہی وقت ہے، اللہ کی قسم! یہ وہی وقت ہے۔''

(مسند الامام احمد : ٥/٤٥٠، سنن ابی داوٗد : ١٠٤٦، سنن الترمذی : ٤٩١، سنن النسائی : ١٤٣٠، سنن ابن ماجہ : ١١٣٩، وسندہٗ صحیحٌ)

اس حدیث کو امام ابنِ حبان رحمہ اللہ (٧/٧ ، ح : ٢٧٧٢) نے ''صحیح'' کہا ہے، امام حاکم

(۲۷۹/۱) نے اسے ''بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح'' قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت بھی کی ہے۔ حافظ نووی رحمہ اللہ نے بھی اس کی سند کو ''بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح'' کہا ہے۔

جب خطبہ نمازِ جمعہ کا حصہ ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نماز کے لیے بیٹھنے کو بھی نماز ہی شمار کرتے تھے تو پھر زائدہ کا نماز اور باقی راویوں کا خطبہ کہنا مخالفت کیسے بن گئی؟ کیا خطبہ سننے والا نماز کے لیے بیٹھا نہیں ہوتا؟ معلوم ہوا کہ نماز سے مراد بھی خطبہ ہی ہے، لہٰذا یہ مخالفت نہیں۔

امام بیہقی رحمہ اللہ (م ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں: **وقول من قال : نصلّی معه الجمعة أراد به الخطبة ، وكأنّه عبّر بالصّلاة عن الخطبة ...**

''جن راویوں نے یہ کہا ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھ رہے تھے، انہوں نے خطبہ ہی مراد لیا ہے، گویا کہ انہوں نے خطبہ کو نماز سے تعبیر کر لیا ہے۔'' (السنن الكبرى للبيهقی : ۱۸۲/۳)

حافظ ابنِ رجب رحمہ اللہ (م ۷۹۵ھ) لکھتے ہیں: **وقوله فی الرّواية الّتی خرّجها البخاریّ : بينما نحن نصلّی مع النّبیّ ، لم يرد به أنّهم انفضّوا عنه فی نفس الصّلاة ، إنّما أراد به ـ والله أعلم ـ أنّهم كانوا مجتمعين للصّلاة ، فانفضّوا وتركوه .**

''راوی کا امام بخاری کی بیان کردہ ایک روایت میں یہ کہنا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، اس سے راوی کی مراد یہ نہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے اندر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، بلکہ اس کی مراد یہ ہے کہ وہ نماز کے لیے جمع ہو چکے تھے، پھر وہ بھاگ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ گئے۔''

(فتح الباری لابن رجب : ٤٢٤/٥)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (۷۷۳۔۸۵۲ھ) لکھتے ہیں: **فقوله : نصلّی ، أی ننتظر الصّلاة ، وقوله : فی الصّلاة ، أی فی الخطبة ...** ''راوی کا کہنا کہ ہم نماز پڑھ رہے تھے، اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نماز کا انتظار کر رہے تھے اور راوی کا کہنا کہ ہم نماز میں تھے، اس سے مراد ہے کہ ہم خطبہ میں تھے۔۔۔'' (فتح الباری لابن حجر : ٤٢٣/٢)

اتنی سی بات میرٹھی صاحب کی عقل میں سما نہیں کی اور انہوں نے امتِ مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر اعتراضات شروع کر دیئے ہیں۔ اب تو یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر منکرِ حدیث، حدیث اور اصولِ حدیث سے جاہل ہوتا ہے۔ کاش کہ میرٹھی صاحب صحیح بخاری پر اعتراضات کرنے کی بجائے

اپنے مطالعۂ حدیث کو وسیع کر لیتے!

② میرٹھی صاحب کا یہ کہنا بھی بہت بڑا جھوٹ ہے کہ حصین بن عبدالرحمٰن سے اس حدیث کو پانچ شاگرد بیان کرتے ہیں، کیونکہ صحیح بخاری (۲۰٦٤) میں ہی حصین سے ایک اور شاگرد محمد ابن فضیل (ثقة) بھی ان سے یہی حدیث روایت کر رہے ہیں۔ اسی طرح مسند عبد بن حمید (۳۳۵/۱، ح: ۱۱۱۰) میں ساتویں شاگرد سلیمان بن کثیر (صالح الحدیث فی غیر الزھریّ) بھی حصین سے یہی روایت بیان کر رہے ہیں۔

البتہ وہ دونوں بھی زائدہ کی طرح خطبہ کی بجائے نماز کا ذکر کرتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے میرٹھی صاحب اسے ڈکار گئے ہیں کہ اس طرح یہ کہنا صحیح نہیں رہے گا کہ صرف زائدہ نے یہ الفاظ بیان کیے ہیں، بلکہ اب تو تین راوی اسی طرح بیان کر رہے ہیں!

جب زائدہ کے ساتھ ساتھ محمد بن فضیل اور سلیمان بن کثیر بھی نماز ہی کا ذکر کر رہے ہیں تو میرٹھی صاحب اب کس کس راوی کو وہمی قرار دے کر اپنا مدعا حاصل کریں گے؟

اب قارئین خود اندازہ کر لیں کہ ان کے سب سے بڑے اعتراض کا یہ حال ہے، بعد والوں میں کتنی علمی جان ہوگی؟

اعتراض نمبر ②:

''اور اسناد کا اختلاف یہ ہے کہ زائدہ کی روایت کے مطابق سالم بن ابی الجعد نے حدّثنا جابر کہا تھا۔ پس سالم نے یہ حدیث حضرت جابر سے سنی تھی، لیکن خالد و جریر و ہشیم و ابنِ ادریس چاروں کی روایت میں عن جابر ہے، جو اتصال وانقطاع دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ پس یہ سمجھنا بے جا نہیں کہ جیسے زائدہ کو اس کے متن میں وہم ہوگیا تھا، اسی طرح وہ اس کی اسناد میں بھی وہم کا شکار ہوگئے تھے کہ عن جابر کی بجائے حدّثنا جابر کہہ دیا۔ اور معلوم ہے کہ سالم بن ابی الجعد کثیر الارسال تابعی تھے۔ سالم نے حضرت عمر و عثمان و علی و ثوبان و عبداللہ بن مسعود و ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور عمرو بن عنبسہ و ابوالدرداء و جابان و زیاد بن لبید رضی اللہ عنہم سے حدیثیں روایت کی ہیں اور وہ سب مرسل ہیں۔ سالم نے ان حضرات میں سے کسی سے کوئی حدیث نہیں سنی۔ پس یہ حدیث بھی سالم نے حضرت جابر سے براہِ راست نہیں سنی، کسی نے ان سے بیان کر دی تھی۔ موصوف نے اس کا نام ذکر نہیں کیا۔۔۔'' ("صحیح بخاری کا مطالعہ": ۸۰/۱)

جواب : ① قارئین کرام! میرٹھی صاحب کا کہنا ہے کہ جس طرح زائدہ کو متن میں وہم ہو گیا تھا، اسی طرح اسناد میں بھی وہ وہم کا شکار ہو گئے ہیں، لیکن آپ بخوبی جان چکے ہیں کہ زائدہ کو متن میں کوئی وہم نہیں ہوا، بلکہ وہ میرٹھی صاحب کی اپنی علمی بے مائیگی تھی، لہٰذا جیسے زائدہ کو متن میں وہم نہیں ہوا تھا، اسی طرح اسناد میں بھی وہ وہم کا شکار نہیں ہوئے۔ یہاں بھی میرٹھی صاحب کی اپنی عقل ہی چکرائی ہے۔

② اب میرٹھی صاحب کی اصولِ حدیث سے جہالت ملاحظہ فرمائیں کہ:

(ا) وہ صیغۂ ''عن'' کو اتصال وانقطاع دونوں کا محتمل قرار دے کر اس حدیث کے ضعف کا سبب بنا رہے ہیں، حالانکہ ہم گزشتہ صفحات میں اصولِ محدثین کی روشنی میں بار ہا یہ واضح کر چکے ہیں کہ صرف ''مُدَلِّس'' راویوں کی طرف سے بولا گیا یہ لفظ اتصال وانقطاع دونوں کا احتمال رکھتا ہے، لیکن اگر یہ لفظ ''غیر مدلس'' راویوں کی طرف سے بولا گیا ہو تو اتصال ہی کے لیے ہوتا ہے، دوسرا کوئی احتمال اس میں نہیں ہوتا۔ سالم بن ابی الجعد کثیر الارسال تو ہیں، مگر ''مدلس'' نہیں ہیں، لہٰذا ان کے عن کہنے کو انقطاع پر محمول کرنا صریح جہالت ہے، کوئی علمی کاوش نہیں!

اب بالفرض زائدہ کو وہم بھی ہوا ہو تو اصولِ محدثین کے مطابق یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔

میرٹھی صاحب کے معتقدین سے عرض ہے کہ اگر وہ میرٹھی صاحب کے اس قانون کو صحیح سمجھتے ہیں تو اسے اصولِ حدیث کی روشنی میں ثابت کر دیں، ورنہ انکارِ حدیث سے توبہ کر لیں۔

(ب) کسی کثیر الارسال راوی کا کچھ لوگوں سے ارسال کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کی ہر روایت ''مرسل'' ہی شمار ہوگی، بلکہ جن اساتذہ سے اس کے سماع کے نہ ہونے پر کوئی دلیل قائم ہو جائے، ان سے اس کی روایت ''مرسل'' ہوتی ہے اور باقی سب اساتذہ سے ان کی حدیث بالکل صحیح ہوگی۔ اسے ''مرسل'' کہنا انتہائی بے اصولی ہے۔

محدثین کرام رحمہم اللہ نے اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں انہوں نے کثیر الارسال راویوں کے ان اساتذہ کے نام ذکر کر دیئے ہیں، جن سے انہوں نے ''مرسل'' احادیث بیان کی ہیں، مثلاً المراسیل لابن أبی حاتم، جامع التّحصیل لأحکام المراسیل، تحفة التّحصیل لأحکام المراسیل، وغیرھا اب اگر ان کتب میں محدثین جابر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی

صراحت کر دیں کہ سالم بن ابی الجعد کی ان سے روایت ''مرسل'' ہے تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں، تو پھر بھی ان احادیث کو''مرسل'' کہنا بہت بڑی جہالت یا بڑی ہٹ دھرمی و بے شرمی ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ محدثین نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے سالم بن ابی الجعد کے خود سننے کی صراحت بھی کر دی ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا:

ولم يسمع من ثوبان ، وسمع من جابر بن عبد الله وأنس بن مالك .

''اس (سالم بن ابی الجعد) نے ثوبان رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا، البتہ سیدنا جابر بن عبداللہ اور سیدنا انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے احادیث سنی ہیں۔'' (العلل الكبير للترمذی بحواله تحفة التحصيل : ١٢٠/١)

قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ اتنی صراحت کے بعد بھی جو شخص سالم بن ابی الجعد کی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کو''مرسل'' قرار دیتا ہے، اس کی علمی اہلیت کتنی ہوگی؟

ہر سلیم القلب شخص خود سوچ لے کہ وہ محدثین کرام کی بات مان کر اس حدیث کو''متصل'' مانے گا یا فنِ حدیث سے بالکل جاہل شخص کی بات مان کر اسے''مرسل'' قرار دے گا!

اس پر طرّہ یہ ہے کہ اس حدیث میں سالم بن ابی الجعد نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے اپنے سننے کی صراحت بھی کی ہوئی ہے، جسے وہم قرار دینے کی میرٹھی کاوش بار آور نہیں ہوئی۔

پھر اس پر طرّہ در طرّہ یہ ہے کہ اس حدیث کو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے صرف سالم بن ابی الجعد اکیلے بیان نہیں کر رہے، بلکہ ایک اور راوی ابو سفیان طلحہ بن نافع (حسن الحديث) بھی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے یہی حدیث بیان کر رہے ہیں۔ (صحيح مسلم : ٨٦٣) میرٹھی صاحب نے اس پر بھی اپنی اُلٹی منطق چلانے کی کوشش کی ہے، جس کا بھرپور ردّ ہم اگلے اعتراض کے جواب میں کریں گے۔ ان شاءاللہ!

اللہ کے لیے میرٹھی صاحب کے معتقدین ہی بتائیں کہ کیا تحقیق و تنقید اسی کا نام ہے؟؟؟

اعتراض نمبر ③ : ''اور حصین کے تلامذہ میں سے ہشیم و خالد بن عبداللہ نے اس کی اسناد میں سالم بن ابی الجعد کے ساتھ ابو سفیان طلحہ بن نافع کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن ابو سفیان کی حضرت جابر سے روایت کردہ اکثر احادیث''مرسل'' ہیں۔ شعبہ و علی بن المدینی نے کہا ہے کہ ابو سفیان نے حضرت جابر سے بس چار حدیثیں سنی تھیں۔۔۔'' ("صحيح بخاری کا مطالعه" : ١/٨٠۔٨١)

جواب : ① اکثر احادیث''مرسل'' ہونے سے تمام احادیث کا''مرسل'' ہونا تو

لازم نہیں آتا۔ چار احادیث کے سننے کا تو میرٹھی صاحب کو بھی اعتراف ہے، وہ چار کون سی تھیں؟

آیئے حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ سے پوچھتے ہیں کہ وہ چار احادیث کون سی تھیں، وہ لکھتے ہیں:

''امام بخاری رحمہ اللہ نے اس (ابوسفیان طلحہ بن نافع) کی صرف چار احادیث ہی بیان کی ہیں، میرے خیال میں یہ وہی چار حدیثیں ہیں، جو امام موصوف کے استاذ علی بن المدینی نے مراد لی ہیں۔ ان میں سے دو حدیثیں کتاب الاشربہ میں ہیں، جنہیں امام صاحب نے ابوصالح کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے اور اسی طرح ایک فضائل میں ہے اور چوتھی سورۂ جمعہ کی تفسیر میں (زیرِ بحث) ہے، اس کو امام صاحب نے سالم بن ابی الجعد کی حدیث کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے۔'' (تهذيب التهذيب : ٢٦/٥)

معلوم ہوا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ علی بن المدینی نے طلحہ بن نافع کے سماع والی جو چار احادیث بتائیں تھیں، امام بخاری نے صرف انہی کو اپنی صحیح میں پیش کیا ہے، کیونکہ امام صاحب صحتِ حدیث میں بہت ہی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ امام موصوف کی اس باریک بینی کو خود میرٹھی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں: ''صحتِ حدیث کا التزام کر کے عالی مرتبہ شیخین (بخاری ومسلم) نے علمائے معاصرین اور بعد میں آنے والے مصنفین ومحدثین کے لیے نہایت اچھی مثال پیش کر دی تھی اور تحقیق کی وہ صحیح راہ دکھا دی تھی، جس پر چلنے سے سنتِ نبویہ کی غل وغش سے حفاظت ہو سکتی تھی۔''

(''صحيح بخاری کا مطالعه'' : ١٥/١)

ساری دنیا کو تحقیق کی راہ دکھانے والے امام بخاری رحمہ اللہ کو بھلا اپنے استاذ کی وہ بات معلوم نہ ہوئی ہوگی، جو میرٹھی صاحب کو بھی معلوم ہوگئی ہے اور انہوں نے خود تحقیق کی راہ پر چل کر بھلا اپنے استاذ کی بتائی ہوئی چار احادیث کا خیال نہیں کیا ہوگا؟

پوری امتِ مسلمہ نے صحیح بخاری وصحیح مسلم کی صحت پر جو اتفاق کیا ہے، وہ خود اس بات کی بڑی ٹھوس دلیل ہے کہ یہ حدیث انہی چاروں حدیثوں میں سے ہے، جو ابوسفیان طلحہ بن نافع نے اپنے استاذ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے سنی ہیں۔ اس کے برعکس میرٹھی صاحب اپنے موقف کی تائید میں کوئی دلیل پیش نہیں کر پائے۔ اس بارے میں بھلا امام بخاری اور پوری امت کے بڑے بڑے علمائے کرام کی بات مانی جائے گی، جو اس فن میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے یا میرٹھی صاحب کی بات مانی جائے گی، جو کہ حدیث اور اصولِ حدیث کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں؟ جاری ہے۔۔۔

اہل سنت کون؟

حافظ ابو یحییٰ نورپوری

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إنّ اللّٰه يقبل الصّدقة ويأخذها بيمينه ، فيربّيها لأحدكم ، كما يربّى أحدكم مهره ، حتّى إنّ اللّقمة لتصير مثل أحد)) ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ صدقہ کو قبول کرتا ہے اور اسے اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑتا ہے، پھر اس کی پرورش کرتا ہے، جیسا کہ تم میں سے کوئی ایک اپنے گھوڑے کے بچے کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک لقمہ احد پہاڑ کی طرح ہو جاتا ہے۔'' (سنن الترمذی : ٦٦٢، وسندهٗ ضعيف ، والحديث صحيحٌ ، انظر : صحيح البخاری : ١٤١٠، صحيح مسلم : ١٠١٤)

اس حدیث کے تحت امام ترمذی رحمہ اللہ (م ۲۷۹ھ) فرماتے ہیں:

''بہت سے اہل علم نے اس اور اس مفہوم کی دوسری احادیث صفاتِ الٰہی و نزولِ باری تعالیٰ کے بارے میں کہا ہے کہ اس بارے میں روایات ثابت ہوگئی ہیں، ان پر ایمان لایا جائے گا، ان میں تاویل نہیں کی جائے گی، نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ یہ صفاتِ الٰہی کیسی ہیں؟ امام مالک، امام سفیان بن عیینہ اور امام عبداللہ بن المبارک رحمہم اللہ سے اسی طرح منقول ہے، انہوں نے ان احادیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کو ظاہری معنیٰ پر محمول کیا جائے (تاویل نہ کی جائے)، اہل سنت والجماعت کے اہل علم کا یہی قول ہے۔ رہے جہمی لوگ تو انہوں نے ان روایات کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ تشبیہ ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر صفتِ ید، سمع اور بصر کا ذکر کیا ہے، لیکن جہمیہ نے ان آیات کی تاویل کی ہے اور اہل علم کے خلاف ان کی تفسیر کی ہے، جہمیوں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا، بلکہ یہاں ید (ہاتھ) سے مراد قوت ہے۔ امام اسحاق بن ابراہیم (ابنِ راہویہ رحمہ اللہ) نے فرمایا ہے کہ تشبیہ تو اس وقت ہوگی، جب کہا جائے گا کہ (اللہ تعالیٰ کا) ہاتھ (مخلوق کے) ہاتھ کی طرح ہے یا اس کی مثل ہے، (اللہ تعالیٰ کی) صفتِ سمع (مخلوق کی) سمع کی طرح ہے اور (اللہ تعالیٰ کی) صفتِ بصر (مخلوق کی) بصر کی طرح ہے۔ لیکن جب کوئی آدمی اسی طرح کہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ ید، سمع اور بصر اس کی صفات ہیں، کوئی کیفیت بیان نہ کرے، نہ ہی یہ کہے کہ (اللہ تعالیٰ کی) صفتِ ید، سمع، بصر (کسی مخلوق کی) صفتِ ید، سمع اور بصر کی مثل ہے تو یہ تشبیہ نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ (الشوری : ١١) (اللہ جیسی کوئی شے نہیں، وہ سننے اور دیکھنے والا ہے)۔'' (سنن ترمذی : ٦٦٢)